سہ ماہی
کاروان ادب اسلامی

جلد نمبر:۱۶ جنوری - مارچ ۲۰۱۰ء شمارہ نمبر:۴

مجلس مشاورت
☆مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی، لکھنؤ
☆مولانا سید محمد واضح رشید ندوی، لکھنؤ
☆مولانا محمود الحسن ندوی، دہلی
☆مولانا حافظ فضل الرحیم
☆ڈاکٹر محمود الحسن عارف
☆مولانا محمد سلطان ذوق ندوی

مدیر مسئول
☆مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی
(ناظم شعبۂ برصغیر)

مجلس ادارت
☆مولانا نذر الحفیظ ندوی، لکھنؤ
☆ڈاکٹر سید ضیاء الحسن، لکھنؤ
☆ڈاکٹر شفیق احمد ندوی جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی
☆ڈاکٹر تابش مہدی، دہلی

معاون انتظامی
اقبال احمد ندوی

کمپوزنگ: محمد توفیق بہرائچی
طباعت: پاریکھ آفسیٹ پریس، لکھنؤ

-:زر تعاون:-
اس شمارہ کی قیمت: ۴۰ روپے، سالانہ برائے ہندوستان ۱۵۰ روپے
پاکستان و بنگلہ دیش: ۳۰۰ روپے یا ۱۰ امریکی ڈالر
ان کے علاوہ دیگر ممالک: ۴۰۰ روپے
چیک یا ڈرافٹ اس نام سے بنائیں
RABITA-AL-ADAB-AL-ISLAMI(INDIA)

-:صدر دفتر:-
رابطہ ادب اسلامی (عالمی) پوسٹ بکس ۹۳، ندوۃ العلماء، لکھنؤ

فہرست مضامین

☆ اداریہ

منزل بہ منزل — مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی — صفحہ ۲

☆ مضامین

حضرت سید شاہ نفیس الحسینی نفیس رقم ایک مجموعۂ کمالات شخصیت، — مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی — ۷

ہندوستان میں عربی زبان میں فن سیرت نگاری کا ارتقاء، — ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی — ۱۲

مولانا مودودیؒ کی "سیرت سرور عالمؐ" ایک جائزہ، — ڈاکٹر عبد العزیز عرفان — ۲۰

کند ہم جنس با.....، — ایچ ایم یٰسین — ۲۵

غزل گو شعراء کرام کی حمدیہ شاعری، — فراغ روھوی — ۳۲

سیرت نگاری ادبی اسلامی کے تناظر میں، — مولانا عبد الرحمٰن ملی ندوی — ۴۰

"ادب اسلامی کا" نمائندہ شاعر انتظار نعیم، — قمر سنبھلی — ۴۳

حیرت دہلوی کی "سیرت محمدیہ" اور اس کی ادبی خصوصیت، — مسعود احمد الاعظمی — ۴۸

عربی میں ادبی تنقید کا ارتقاء، — فیصل احمد بھٹکلی ندوی — ۵۵

☆ تبصرہ

اقبال اور اقبالیات، از پروفیسر عبد الحق، — ڈاکٹر تابش مہدی — ۶۰

"خواجہ عزیز الدین عزیز - حیات و شاعری"، — ڈاکٹر ہارون رشید صدیقی — ۶۳

رپورٹ سیمنار

بعنوان: "علامہ محمد بن طاہر پٹنی و دیگر علماء.... — محمد وثیق ندوی — ۶۵

اداریہ

منزل بہ منزل

محمد رابع حسنی ندوی

انسان کے کاموں میں غور وفکر اور احساسات و جذبات دونوں اپنی اپنی جگہ کارفرما رہتے ہیں، غور وفکر کا تعلق خاص طور سے عقل انسانی سے ہے، اس کی صلاحیتوں سے انسان ضروریات زندگی کے وسائل معلوم کرتا اور حاصل کرتا ہے، اور اس کے ذریعہ انسان نے غیر معمولی علمی اور عملی ترقی کی اور تمدن کا ترقی یافتہ نظام قائم کیا، اور جہاں تک احساسات وجذبات کا تعلق ہے تو اس کے ذریعہ انسان نے پسند و ناپسند کی اپنی اپنی راہ بنائی، اور غور وفکر کا معاملہ ہو یا پسند و ناپسند کا معاملہ ہو، ان کے اظہار کے لئے انسان زبان کا سہارا لیتا ہے، غور وفکر کا حاصل علم بنتا ہے، اور احساسات و جذبات کا حاصل ادب بنتا ہے، انسان کے پسند و ناپسند کا معاملہ کبھی تو عقل انسانی کا ساتھ دیتا ہے اور کبھی عقل انسانی کے مشورہ کو نظر انداز کر کے چلتا ہے، لیکن انسان کو اللہ تعالی نے ایک امتیازی خصوصیات رکھنے والی مخلوق بنایا ہے، اس کو یہی بات زیادہ پسند ہے کہ وہ پسند و ناپسند کو عقل کی رفاقت سے الگ نہ رکھے، اسلام میں تعلیم بھی اسی کی دی گئی ہے۔

لیکن مغربی ذہن اور اس کے فلسفۂ زندگی نے آزادی کا جو تصور اختیار کیا ہے، اس کے تحت پسند و ناپسند کو عقل کے مشوروں سے آزاد رکھنا پسند کیا ہے، لہذا وہ ادب کو محض اپنی انفرادی خواہشات کے تابع اور بیباک رکھنا چاہتا ہے، وہ اس پر کنٹرول تو بڑی چیز ہے، اس کے سلسلے میں کوئی ناصحانہ بات بھی سننا نہیں چاہتا، خواہ ادب کی اس حد تک آزادی اور اس کی بیباک روی انسان کو غلاظت ذہنی تک پہونچادے اور اس کو ایک فلسفہ بنا کر مختلف خوبصورت اصطلاحوں سے قابل قبول بنانے کی کوشش کرنے لگتا ہے، اسی میں جدیدیت اور ما بعد جدیدیت کی اصطلاحات سامنے آئیں، اور اب مابعد جدیدیت سے بھی آگے جانے کی کوشش ہے۔

اس کے برخلاف اسلامی نقطۂ نظر ادب کے مغربی فلسفہ کے بجائے انسان کے ایک برتر اور ترقی یافتہ مخلوق ہونے کے ناطے سے صالح مقصدیت اور انسانی معیار کی خوبی کو بنیاد بناتا ہے کہ پسند اور دلنوازی کے ساتھ نافعیت بھی ہو، اور انسانی اقدار کی راہ سے نہ ہٹے، اسی کو ہم ادب اسلامی سے تعبیر کرتے ہیں، ہم کو رب العالمین کی طرف سے زندگی کو سنوارنے کے لئے قرآن کریم ملا اور حدیث نبوی سے رہنمائی ملی، قرآن مجید خالق کائنات خالق جن وانس کا کلام ہے، جس نے انسان کو صرف بنایا ہی نہیں، بلکہ اس کی خصوصیات ومزاج اور اس کی صلاحیتوں کی تشکیل بھی اسی نے کی ہے، اس سے زیادہ کون جانتا ہے کہ انسان کی ضروریات اور پسند و ناپسند کی کیفیات کیا ہیں اور یہ کہ انسانی کلام میں تاثیر و دلنوازی کیسے پیدا ہوتی ہے، عربی زبان و ادب کی معیاری شخصیتوں کی نظر میں قرآن مجید کی تاثیر کلام کے بعد حضرت محمد مصطفی ﷺ کے کلام کی تاثیر و بلاغت بھی اعلی ہے، اور ادب اسلامی کو ان دونوں کی سرپرستی سے بڑی قوت ودلنوازی ملتی ہے، دونوں مآخذ سے ادب کو جو رہنمائی ملتی ہے وہ دوسری جگہوں سے ملنے والی رہنمائی سے زیادہ قوی اور کارگر ہے۔ اسلامی ادب جو بھی رہا یا ہوگا، وہ ان دو کی رہنمائی سے، پھر ان سے مستفید ہونے اور

اعلیٰ ذوق کو سنوارنے میں مدد لینے والوں کے ادب سے استفادہ کرنے سے مستغنی نہیں ہے، اور ادب اسلامی کو ان دونوں جہتوں سے بڑی قوت اور دلنوازی ملی ہے اور ملتی رہے گی۔

قرآن مجید نثر میں آیا، لیکن اثر انگیزی میں شعر کی اثر انگیزی سے بھی بڑھ گیا اور حضورﷺ جن کو رائج طریقہ کی اور کتابی تعلیم حاصل نہیں ہوئی تھی، لیکن آپ کو ماحول سے جو اچھی اور فصیح زبان کا ماحول تھا، فصیح زبان پر آپ کا نشو ونما ہوا تھا، پھر آپ پر قرآن مجید کا نزول ہوا، اس سے آپ کی فصاحتِ کلام میں مزید خوبی پیدا ہوئی جو اعلیٰ ادب کے نمونوں سے پیدا ہونے والی خوبی سے بڑھی ہوئی تھی، آپ کے بعد آنے والے حضرات نے ان دونوں یعنی کلام الٰہی اور کلام رسول سے بڑا فائدہ اٹھایا، اور برابر یہ سلسلہ جاری رہا، اور اس سے عربی زبان وادب کو جو خوش بیانی اور اثر انگیزی ملی وہ عربی زبان وادب کی تاریخ میں مؤثر اور اعلیٰ ادبی نمونوں کی صورت میں کتابوں میں موجود ہیں، ان کی تاثیر و بلاغت کیلئے یہ کافی ہے کہ ان نمونوں نے اپنے اپنے عہد میں سامعین وقارئین کے ذہنوں اور طبیعتوں میں انقلاب پیدا کیا، اور ادب کے دائرے میں مختلف اصناف سخن وجود میں آئے، جن سے عربی کی پڑوسی زبانوں پر بھی اثر پڑا اور نئے ادبی رجحان پیدا ہوئے فارسی اور اردو اور اس طرح کی کئی دیگر زبانوں میں یہ اثرات دیکھے جاسکتے ہیں۔

ادب کے سلسلے میں کہا جاتا ہے کہ اس کو آزاد ہونا چاہئے، اس کو کسی رہنمائی کا پابند نہ ہونا چاہئے، اگر اس خیال کو کسی نوعیت سے تسلیم بھی کرلیا جائے تو بھی انسان کی صلاحیتیں ایک حد تک ہی جاسکتی ہیں، کچھ نہ کچھ پابندی ان کی مجبوری ہے، چنانچہ انسان کا کوئی کام اس سے یکسر خالی نہیں ہوسکتا، کیونکہ انسان کی طبیعت میں اور اس کی فطرت میں جو حدود رکھے گئے ہیں وہ ان سے باہر نہیں ہوسکتا، اس کا کام ان حدود کی پابندی کے ساتھ ہی ہوگا، وہ اس مجبوری کی صورت میں رنگ آمیزی تو کرسکتا ہے، لیکن ان سے باہر نہیں ہوسکتا، ان کے علاوہ وراثتی دائرہ میں اس کی کچھ مجبوریاں اور پابندیاں بھی ہوتی ہیں جو اس کو مکمل آزاد نہیں بننے دیتی ہیں، اپنے ماحول کے تقاضے اور انسانی صلاحیت کے حدود سے کچھ بھی ہو کسی نہ کسی حد تک وہ بالکل آزاد نہیں ہوسکتا، جب وہ کسی نہ کسی طریقہ سے کچھ نہ کچھ دائروں کا پابند ہوتا ہے تو پھر خیر پسندی خود اپنے اختیار سے اگر اپنائے اس میں بیجا بات کیا ہوسکتی ہے، خیر پسندی ایک اچھی صفت ہے جو انسان کے مقام اور کام میں خوبی پیدا کرتی ہے، ادب اسلامی اس کا داعی ہے، لیکن خیر پسندی کے ساتھ ادب اسلامی کے نقطہ نظر کو تنگ اور محدود نہیں رکھا گیا، اسے انسان کی ضرورتوں اور پسند وناپسند کے فطری اور جائز پابندی کے ساتھ وسیع ترین حدود تک جانے کی اجازت دی گئی ہے، بلکہ اس کی وسعت و تنوع کو پسند کیا گیا ہے، چنانچہ اس میں انسان کے اندرونی جذبات واحساسات کی وسیع ترجمانی ملتی ہے، ادب کا تعلق چونکہ آدمی کے دل سے ہے، لہٰذا اسلامی ادب اس کے جائز تقاضوں کو مانتا ہے، لہٰذا وہ اپنی فنی خصوصیات کے لحاظ سے تنوع اور وسعت دونوں کا حامل ہے، اور اس نے مختلف زمانوں میں غیر معمولی اثرات بھی ڈالے ہیں، اور ان سے انسان کی نفسیاتی اور اندرونی کیفیات کی ترجمانی کا بڑا کام انجام پایا ہے۔

مولانا سید محمود الحسن ندویؒ

(سابق صدر مکتب اقلیمی ہندوستان، دہلی)

رابطہ ادب اسلامی ہندوستانی شاخ کو گذشتہ مدت میں اپنے کئی کارگذار ارکان کے جدا ہونے کا نقصان اٹھانا پڑا، جن کی موجودگی اور تعاون سے ہندوستانی شاخ کو پوری تقویت حاصل تھی، ان میں بھوپال کے مولانا محمد لقمان ندوی ازہری کا انتقال کئی سال قبل ہوا، لیکن ادھر دو سال کے اندر ہندوستانی شاخ کے مکتب اقلیمی کے صدر ڈاکٹر سید محمد اجتباء حسینی ندوی جو رابطہ کی تاسیس کے وقت سے شریک کار تھے، ہم سے جدا ہوئے، ان کی جدائی پر ان کی جگہ کے لئے مولانا سید محمود الحسن ندوی جو ادب وثقافت میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے، اور عمر کے لحاظ سے سینئر شریک کار تھے، مکتب

اقلیمی کے صدر مقرر ہوئے، لیکن افسوس یہ ہے کہ ایک سال بھی نہ گذرا ہوگا کہ انہوں نے بھی داعیٔ اجل کو لبیک کہا، اس طریقہ سے مکتب اقلیمی کے صدر دفتر کو بہت مختصر مدت میں اپنے دو صدروں کی مفارقت سے سابقہ پڑا، ان جدا ہونے والے رفقاء سے رابطہ کے کاموں میں بڑی تقویت تھی، اور ان کی کارکردگی باعثِ طمانیت تھی، اللہ تعالیٰ ان کو اجرِ جزیل سے نوازے۔

مولانا سید محمود الحسن ندوی نے ندوہ میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد ندوہ ہی میں ادب عربی کی تدریس کی خدمت انجام دی، پھر ایک سال کے لئے عراق میں علمی استفادہ کے لئے وقت گزارا، پھر ہندوستان واپس آنے پر اردو صحافت اور مضمون نگاری کا کام انجام دیا، پھر دہلی کے مرکزی ریڈیو اسٹیشن کے شعبۂ عربی کے ذمہ دار منتخب ہوئے، اور عربی پروگراموں کی تشکیل میں ان کا حصہ رہا، وہاں سے رٹائر ہونے کے بعد سعودی سفارت خانہ دہلی میں شعبہ صحافت میں ذمہ دار رہے، وہاں سے رٹائر ہو کر نجی طریقہ سے ادب وثقافت اور اسلامی رجحانات کی تقویت کے لئے کام کرتے رہے، اور ڈاکٹر سید محمد اجتباء حسینی ندوی کی رحلت کے بعد مکتب اقلیمی کے صدر منتخب ہوئے، اور تھوڑی ہی مدت میں ہم سے سے جدا ہوئے۔ طبیعت کے بہت بااخلاق، باذوق اور دوست نواز شخص تھے، ان سے مل کر آدمی کو خوشی ہوتی تھی، اور ان کا انداز گفتگو ملنے والے کے لئے ان سے تعلق پیدا کرتا تھا، اس لئے بھی ان کی جدائی ان کے سب واقف کاروں کے لئے بہت رنج دہ ثابت ہوئی۔

ان سے میرا تعارف بچپن ہی سے تھا جو دار العلوم ندوۃ العلماء میں دوران تعلیم قائم ہوا تھا، اور برابر قائم وجاری رہا، ان کا بھی اقامتی وطن لکھنؤ تھا، اس لئے ان کی رفاقت خاصی رہی، اور دوستانہ و برادرانہ تعلقات رہے، اس لئے ان کی مفارقت خاصی محسوس ہوئی۔ ان کے چھوٹے بھائی پروفیسر سید ضیاء الحسن ندوی مرحوم ان کے تعلقات کی بنا پر چھوٹے بھائی کی طرح تھے، اور اسی انداز سے تعلق رکھتے تھے، اور رابطہ ادب اسلامی میں سرگرمی کے ساتھ شریک ہوتے تھے، وہ ان سے کچھ مدت قبل انتقال کر گئے، ان کے انتقال کا اثر ان کے بڑے بھائی نے تو محسوس کیا ہی، ہم خادمان رابطہ نے بھی بہت محسوس کیا تھا، اللہ تعالیٰ دونوں کو اجر جزیل عطا فرمائے۔

ان دونوں بھائیوں کو قدرت کی طرف سے ادبی ذوق بہت اچھا ملا تھا، مولانا سید محمود الحسن ندوی صاحب کا یہ ذوق زیادہ تر صحافتی دائرہ میں رہا، ان کی تحریریں قارئین کو بہت پسند آتی تھیں، وہ لکھنؤ سے شائع ہونے والے موقر اردو روزنامہ میں ہفتہ وار عالم اسلام کے حالات پر تبصرہ کرتے تھے، اخبار کے قارئین اس سے بہت محظوظ ہوتے تھے، پھر انہوں نے اپنی ادبی صلاحیت کا ثبوت عربی زبان میں ہندوستانی ریڈیو کے عربی شعبہ میں رہکر دیا، اور ادبی مجالس میں بھی ان کی یہ صلاحیت ظاہر ہوتی تھی، اور احباب محظوظ ہوتے تھے۔ انہوں نے اگرچہ باقاعدہ کوئی تصنیفی کام تو انجام نہیں دیا لیکن مضامین کے ذریعہ اور مجالس مذاکرہ میں ان کی شگفتہ گفتگو اور نکتہ سنجی میں ادبی لطف نمایاں طور پر محسوس کیا جاتا تھا، وہ ندوۃ العلماء میں استاد ادب رہنے کے دوران بھی اپنے طلباء کے لئے اور اپنے احباب میں بھی اپنی خوش کلامی اور نکتہ سنجی کے لحاظ سے مقبول رہے تھے، ان کے چھوٹے بھائی سید ضیاء الحسن ندوی مرحوم ان سے اتنے خورد تھے کہ باقاعدہ ان کی سرپرستی اور تربیت میں رہے تھے، شاید اسی سرپرستی نے ان میں بھی ادبی مذاق پیدا کیا، جو عملاً ان کی تحریروں اور مذاکرات علمی میں ظاہر ہوتا تھا، اور اسی تعلق سے وہ ہندوستان کی رابطہ ادب اسلامی شاخ کے اہم کارگذار اور رکن بنے، اور ان کے بڑے بھائی سید محمود الحسن ندوی رابطہ کی اقلیم ہند کی شاخ میں صدارت کا عہدہ خالی ہونے پر صدر منتخب ہوئے تھے، لیکن وہ تھوڑی ہی مدت میں ہم سب سے جدا ہو کر اپنے مالک حقیقی سے جا ملے، اللہ تعالیٰ ان کو جنت میں کروٹ کروٹ چین عطا فرمائے۔ إنا إليه و إنا إليه راجعون۔

مولوی ڈاکٹر سید محمد اجتباء ندوی رحمۃ اللہ علیہ

(سابق صدر مکتب اقلیمی ہندوستان، دہلی)

مولوی ڈاکٹر سید محمد اجتباء حسینی ندوی نے اپنی علالت کے تسلسل کے نتیجہ میں ۲۰/ جون ۲۰۰۸ء کی دوپہر میں اس دار فانی سے دار باقی کو رحلت کی ﴿إنا لله و إنا إليه راجعون﴾، مولوی اجتباء صاحب بستی کے ایک دینی، علمی اہمیت رکھنے والے خاندان سے تعلق رکھتے تھے، اور وہ خاص طور پر تحصیل علم اور علمی مشغولیت کے راستہ میں مختلف منزلوں اور مختلف مرحلوں سے گزرے تھے۔ انہوں نے دار العلوم ندوۃ العلماء میں دینی تعلیم کی تکمیل کی، پھر دمشق یونیورسٹی شام کے کلیۃ الشریعہ سے بھی تعلیمی استفادہ کیا اور وہاں سے فراغت حاصل کی، اس طریقہ سے ان کو ہندوستان میں دار العلوم ندوۃ العلماء کے اساتذہ سے استفادہ کے ساتھ ساتھ شام کے علماء سے بھی استفادہ کا موقع ملا، اس کے لئے انہوں نے وہاں پانچ سال گزارے، وہاں سے ہندوستان مراجعت پر دار العلوم ندوۃ العلماء میں استاد مقرر ہوئے، اسی کے ساتھ ساتھ یونیورسٹی کی تعلیم سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مسلم یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی، اور جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کے عربی شعبہ میں استاد مقرر ہوئے، اسی دوران ان کو اندرون ملک اور بیرون ملک کی یونیورسٹیوں میں تعلیم دینے کے مختلف مواقع ملے، اور ہندوستان اور سعودی عرب دونوں جگہ ان کو اشتغال علمی کا موقع حاصل ہوا، اس طرح علم کے متنوع ماحول میں رہنے سے جو وسیع تجربات ہوتے ہیں وہ ان کو حاصل ہوئے۔

آخر میں وہ رٹائرمنٹ کی عمر کے قریب الہ آباد یونیورسٹی میں صدر شعبۂ عربی کے عہدہ سے رٹائر ہوئے، اور دہلی اوکھلا میں جامعہ ملیہ کے قریب سکونت اختیار کرلی، اور آزادانہ علمی و دینی کاموں میں مشغول ہوئے۔

ان کے خاندان کے مورث اور جد اکبر مولانا سید جعفر علی نقوی بستوی تھے، جو امیر المؤمنین حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ تھے، اور ان کے مشورہ سے انہوں نے ہندوستان میں تعلیمی و دعوتی کام کی ذمہ داری سنبھالی، اور مشرقی یوپی اور بہار میں درجنوں دینی مدارس قائم کئے، اور ان کی ان کوششوں سے علم دین کی اشاعت کا بڑا کام ہوا۔ ان کا علمی و دینی جذبہ ان کے خاندان میں بحیثیت وراثت کے منتقل ہوا، اور مولوی اجتباء صاحب کے بڑے بھائی مولانا سید محمد مرتضیٰ نقوی مظاہری ایک بڑے فاضل اور کارگزار شخصیت ہوئے، اور انہوں نے اپنے خاندانی مورث وجد مولانا جعفر علی صاحب کی حضرت سید احمد شہیدؒ سے محبت و تعلق کی نسبت سے مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ سے قربت اور محبت کا تعلق قائم کیا، تعلیمی مرحلہ سے فراغت کے بعد ہی سے انہوں نے پوری زندگی ان کے قریب رہکر گزاری۔ وہ دار العلوم کے استاد بھی رہے، اور اس کے کتب خانہ کے مہتمم بھی رہے، اور حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے تمام دینی و سماجی کاموں میں معاونت بھی کرتے رہے اور اسی تعلق کے ساتھ ۷۲ سال کی عمر پوری کی۔ انہوں نے ڈاکٹر سید محمد اجتباء ندوی کے بڑے بھائی ہونے کے تعلق سے ان کی تعلیم و تربیت کی پوری رہنمائی کی، والد کے انتقال کے بعد ان کے لئے والد جیسی سرپرستی کرتے رہے، مولوی اجتباء صاحب کی زندگی پر ان کی تربیت کے گہرے اثرات ہوئے، اور اس طرح حضرت سید احمد شہیدؒ کی نسبت سے ان کے اس پورے خاندان کو حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی اور ان کے خانوادہ سے گہرا ربط رہا، اس تعلق سے بھی مولوی اجتباء مرحوم حضرت مولانا سے قربت رکھتے تھے، اور ان کے مشوروں پر چلنے کو اپنے لئے مفید سمجھتے تھے۔ اور اسی نسبت سے ندوہ سے بھی گہرا تعلق رکھتے تھے، اور شروع میں استاد کی حیثیت سے یہاں رہے، اور بعد میں یہاں سے دوسری جگہوں میں منتقل ہونے پر بھی ندوۃ العلماء سے علمی ربط رکھتے رہے، اور اخیر میں ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامیہ کے رکن بھی منتخب ہوئے۔

انہوں نے مختلف علمی اداروں سے واسطہ پڑنے پر اور تعلیمی و علمی کاموں سے تعلق رکھنے کی بناء پر اہم موضوعات پر تصنیفی کام بھی انجام دیئے، اور ادب عربی کے تعلق سے بھی ذمہ داریاں انجام

دیں۔ رابطہ ادب اسلامی عالمی کے قیام کے تعلق سے جو مشورے ہوئے ان میں وہ عرب ادباء کے ساتھ شریک رہے، اور رابطہ ادب اسلامی کے قیام کے بعد اس کے وقیع رکن اور بعد میں پورے ہندوستانی حلقہ کے صدر بھی مقرر ہوئے۔ ان سے رابطہ ادب اسلامی کو تقویت پہونچی، اس طرح ان کے انتقال سے کئی حیثیتوں سے خسارہ محسوس کیا جارہا ہے۔ مذکورہ مختلف وجوہ سے میرا بھی ان سے قریبی ربط رہا، یہ ربط ندوۃ العلماء میں ان کی ابتداء تعلیم سے اختتام تعلیم تک رہا جو بعد میں آخر تک قائم رہا، اس کی بناء پر میں نے ان کے حادثۂ وفات کو اپنے قریبی اور عزیز شخص کا حادثہ محسوس کیا۔

انہوں نے مجھ سے اپنی طالب علمانہ زندگی سے اپنی بعد کی زندگی تک اپنے بڑے بھائی کی حیثیت سے تعلق رکھا، ان کے بڑے بھائی مولانا سید محمد مرتضی صاحب نقوی مظاہری مرحوم (جو کہ عزیزان مولوی عبید اللہ اسعدی اور مولوی سعید حسن اور مولوی عمیر وغیرہم کے والد تھے) ہمارے بڑے بھائی مولانا محمد ثانی حسنی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خاص اور عزیز ترین دوستوں میں تھے، ان کے ان سے چھوٹے اور مولوی اجتباء صاحب سے بڑے بھائی مولوی سید محمد عبد اللہ صاحب میرے ہم عمر اور دوست ہیں، ان دونوں کے تعلق نے بھی ان کے تعلق کو مجھ سے بڑھایا۔

عزیزی مولوی سید محمد اجتباء ندوی نے دار العلوم ندوۃ العلماء میں اپنے طالب علمانہ پھر مدرسانہ مرحلہ میں عربی زبان وادب سے جو گہرا تعلق پیدا کرلیا تھا، اس کی بناء پر ان کے اور برادر عزیز مولوی سید محمد الحسنی مرحوم نے مولانا سعید الرحمٰن صاحب حال مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء سے ان کی رفاقت رہی تھی، جب لکھنؤ سے البعث الاسلامی جاری ہوا تو اس کام میں مولوی اجتباء ندوی بھی عربی سے دلچسپی رکھنے والے اس گروپ میں شریک ہوئے، ان تینوں کے درمیان، اور بعد میں موجودہ مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء اور عزیزی مولوی محمد واضح رشید ندوی کے ساتھ فکری ہم آہنگی، دعوتی فکر اور مسلم مسائل میں ان کا اشتراک رہا، اور مولوی محمد واضح رشید کے دہلی کے قیام میں خاص طور پر ان میں اور مولوی اجتباء صاحب کے درمیان ربط زیادہ بڑھا جو تا حال قائم رہا۔

عزیزی مولوی محمد اجتباء ندوی کو ایک خصوصیت یہ حاصل رہی کہ انہوں نے عالم اسلام کی اہم اور چوٹی کی شخصیات سے استفادہ کیا، جن میں وہاں کی علمی ودعوتی شخصیات کے سربراہ شیخ مصطفیٰ سباعی اور ان کے دیگر رفقاء تھے۔ ان کے اس متنوع تعلقات کی بناء پر ان کو یہ خصوصیت بھی حاصل رہی کہ وہ بین الاقوامی پروگراموں میں مدعو کئے جاتے، اور وہاں وقیع طریقہ سے شرکت کرتے، ان پروگراموں میں شرکت کے لئے سفر کرتے، دمشق یونیورسٹی، جامعہ ازہر، مراکش، اردن اور کویت کی یونیورسٹیوں میں ان کے محاضرات ہوئے، ان کا آخری اہم علمی سفر کویت یونیورسٹی کی دعوت پر دسمبر ۲۰۰۲ء میں ہوا جہاں انہوں نے ''ہندوستان اور عرب کے ادبی روابط'' کے عنوان پر کلیدی خطبہ انٹرنیشنل سیمینار میں پیش کیا، جو بہت مقبول ہوا۔

ہندوستانی حکومت نے عربی زبان وادب میں ان کی نمایاں خدمات کی وجہ سے صدر جمہوریہ اوارڈ سے بھی نوازا تھا۔

اللہ نے بہت سی خصوصیات اور اوصاف وکمالات سے انہیں نوازا تھا، وہ اپنی صلاحیتوں سے لوگوں کو متاثر کرتے اور لوگ ان کے قدرداں تھے، متعدد اہم کتابیں بھی ان کے قلم سے نکلیں، فکر اسلامی کے موضوع پر اسلام کی چودہ سو سالہ تاریخ کا جائزہ ''تاریخ فکر اسلامی'' کے نام سے پیش کیا۔ اس کے علاوہ نواب صدیق حسن خاں قنوجی کی شخصیت وکارناموں پر اور مولانا سید ابو الحسن علی حسنی ندویؒ پر عربی میں کتابیں لکھیں، اور عورت اسلام کی نظر میں، حقوق انسانی اسلامی شریعت میں، اور نقوش تابندہ کے عنوانات سے مختلف الموضوعات کتابیں تصنیف کیں، جو ان کے لئے صدقۂ جاریہ ہیں۔

لگ بھگ ۷۴ سال کی عمر میں جمعہ کے دن ۲۰ رجون ۲۰۰۸ء کو نئی دہلی میں انتقال کیا، اللہ تعالیٰ سے دعاء ہے کہ ان کی نیک کوششوں کو قبول فرمائے اور زیادہ سے زیادہ اجر عطا فرمائے، اور ان کی لغزشوں کو معاف فرمائے، اور امت اسلامیہ کی دینی اور علمی ضرورتوں میں ان کا بدل عطا فرمائے۔

حضرت سید شاہ نفیس الحسینی نفیس رقم صاحب رحمۃ اللہ علیہ

ایک مجموعۂ کمالات شخصیت

از (مولانا) سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ
ناظم ندوۃ العلماء، لکھنؤ (انڈیا) وصدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ

گذشتہ دنوں رشد و ہدایت اور تزکیہ وارشاد کی حامل ایک عظیم شخصیت مزید ہم سے جدا ہوگئی، یہ شخصیت سید شاہ نفیس الحسینی کے نام سے مشہور و معروف تھی، سید شاہ نفیس الحسینی رحمۃ اللہ علیہ سہ گونہ پہلوؤں میں باکمال خصوصیت کے حامل تھے۔ ان کی خصوصیت کا آغاز خطاطی کے اعلیٰ مرتبہ سے شروع ہوا تھا، اور اس میں ان کو جو امتیاز حاصل ہوا وہ بہت دلکش اور حسن تحریر سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے نہایت پسندیدہ تھا۔

ان کی دوسری خصوصیت ان کے اندر چھپی ہوئی صلاحیت شعر گوئی تھی، جس میں خوش ذوقی اور برجستگی اور دلی جذبات کی ترجمانی نمایاں ملتی ہے۔ غزل جو ہماری اردو شاعری کی جان سمجھی جاتی ہے، اصحاب ذوق اپنے قلبی احساسات کی ترجمانی کے لئے بھی اس کو اختیار کرتے ہیں، وہ ہم کو حضرت نفیس الحسینی کے کلام میں بھی نمایاں ملتی ہے، ان کے کلام کو دیکھ کر حسن ادا اور ندرت خیال کا پتہ چلتا ہے۔

اسی کے ساتھ ساتھ ان کے دینی جذبہ نے ان کی شخصیت میں تیسرے پہلو کو نمایاں کردیا، اور وہ پہلو حب رسول (ﷺ) و حب آل رسول (ﷺ) اور حب اصحاب رسول (ﷺ) اور پھر اولیاء امت سے محبت و شیفتگی کا پہلو ہے، اسی پہلو کے تحت ان کا تعلق مرشد وقت حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ سے ہوگیا، اور اس تعلق نے تیزی کے ساتھ ترقی کرکے گہری وابستگی کی شکل اختیار کرلی، اور جلدی ان کو اپنے شیخ کا اعتماد حاصل ہوگیا۔

حضرت شاہ نفیس الحسینی خاندان حضرت گیسو دراز کے فرد ہیں، اور نسبی سلسلہ میں سیدنا حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ تک پہونچتے ہیں، یہ دونوں تعلق جو نسبی حیثیت رکھتے ہیں، نسبی

> اور انہی نسبتوں اور تعلق کی وجہ سے دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ سے انہیں تعلق تھا، اور اس ادارہ کے فرزندوں پر بھی شفقتیں فرماتے اور دعاؤں کا اہتمام کرتے تھے، اللہ تعالیٰ انہیں اس کی بہترین جزاء عطاء فرمائے، آمین۔

سے بڑھ کر دینی جذبہ سے بھی معمور بنے، اس طریقہ سے جو خاندانی انتساب انہیں سیدنا حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ہے، اس انتساب کی ان کے دل میں بڑی قدر رہی، اور اسی وجہ سے انہیں ان سے اور اپنے اسلاف سے بڑی عقیدت رہی، اور اس عقیدت کو بھی ان کے دینی رجحان کو بڑھانے میں بڑا دخل رہا ہے، جس کا انہوں نے اظہار بھی کیا ہے، اور اس عقیدت کی ترجمانی ان کی شاعری میں بھی ملتی ہے، چنانچہ حضرت شاہ نفیس الحسینی رحمۃ اللہ علیہ کو تین رخوں سے دیکھا اور پہچانا جانے لگا۔ ان کو اگر تصوف اور ارشاد کے زاویہ سے دیکھا جائے تو وہ حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ کے فیض کے حامل نظر آتے ہیں، محبت رسول (ﷺ) اور محبت آل رسول (ﷺ) کی حیثیت سے دیکھا جائے تو اس میں بھی محبت و وارفتگی پوری طرح جھلکتی نظر آتی ہے، جو نسبی تعلق کی وجہ سے اور بھی اثر انگیز بن گئی ہے۔

ان کو اگر شاعرانہ پہلو سے دیکھا جائے تو وہ استادانہ مقام پر فائز نظر آتے ہیں، غزل ہو یا منقبت ہو، یا شاعری کی دینی صنف یعنی حمد و نعت ہو، حب رسول (ﷺ) ہو، ان کے یہاں دلکش انداز کلام ملتا ہے، اور ایک بڑی خصوصیت یہ نظر آتی ہے کہ فکر کی بلندی اور واردات قلب کی اثر انگیزی بھی بخوبی ملتی ہے، اور اسی خصوصیت کی راہ سے امت کے سلسلہ میں پیش آنے والے دل دُکھانے والے حالات کا احساس بھی ان کی شاعری میں جھلکنے لگا، اور ان کی شاعری کا ایک موضوع بنا۔

ان کی شاعری میں ان کے قلب کی دردمندی اور اپنی محبوب شخصیتوں سے ان کی محبت نے ایک عاشقانہ انداز پیدا کر دیا ہے، اس عاشقانہ انداز میں ان کا دینی جذبہ شاعری کے بے باکانہ رویہ سے ان کو بچاتا بھی رہا، اسی لئے برجستگی کلام اور اس کے ساتھ احتیاط جو ایک طرح مشکل عمل ہے، ان کے یہاں ملتی ہے، ان کے دیوان کے تعارف میں علامہ محمد تقی عثمانی صاحب نے خوب لکھا ہے کہ:

"عشق و شاعری کا چولی دامن کا ساتھ ہے، جب دل میں عشق کی آگ سلگتی ہے تو اس کا دھواں شعر کے سانچہ میں ڈھل جاتا ہے، حضرت نفیس شاہ صاحب مدظلہم کی شاعری درحقیقت اسی عشق کے دھویں سے عبارت ہے، لیکن عشق اگر مجازی ہو تو اس کے دھویں میں نہ جانے کتنی کثافتیں شامل ہو جاتی ہیں ۔

وہ عشق جس کی آگ بجھا دے اجل کی پھونک
اس میں مزا نہیں تپش انتظار کا

حضرت نفیس شاہ صاحب کا عشق چونکہ حقیقی ہے، اس لئے اس کا دھواں ان کثافتوں سے پاک اور لطافتوں کا وہ دلآویز مجموعہ ہے جس کی پاکبازی کی قسم کھائی جا سکتی ہے، اللہ تعالیٰ نے اسے بلندیٔ خیال اور سوز و گداز کے ساتھ حسن اظہار کا وہ سلیقہ بھی عنایت فرمایا ہے، جسے کہنے والوں نے "سحر حلال" سے تعبیر کیا ہے، و إن من البیان لسحراً۔"

(ماخوذ از مقدمہ برگ گل)

مولانا عثمانی نے اس سلسلہ میں مثال کے طور پر ان کے یہ چند شعر بھی دیئے ہیں، ملاحظہ ہو:

کیوں شکوۂ غم اے دل ناشاد کرے ہے
اک غم ہی تو ہے جو تجھے آباد کرے ہے
دل محوِ محبت ہے اسے کچھ نہیں پروا
آباد کرے کوئی کہ برباد کرے ہے
پادے ہے وہی عشق سرفرازیٔ عالم
جس عشق پہ وہ حسنِ ازل صاد کرے ہے
ہاں ساقی کوثرؐ سے صبا! عرض یہ کرنا

اک رندِ سیہ مست بہت یاد کرے ہے

حضرت نفیس الحسینی کے یہاں عشق رسول (ﷺ) و محبت بزرگان دین پر مشتمل اچھا خاصا کلام ملتا ہے، مدحِ رسول (ﷺ) کے سلسلہ میں یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

ملائک ساتھ ہیں دامن سنبھالے
حرا سے آرہے ہیں کملی والے
اُمڈ آئے ہیں بادل کالے کالے
مرا ایمان ساقی کے حوالے
تجھے اے وحشتِ دل ! دینے والے
دعائیں دے رہے ہیں دل کے چھالے
زکوٰۃ حسن جاناں بٹ رہی ہے
گدائے عشق ! قسمت آزمالے

اور مدینہ طیبہ کی نسبت سے :

اللہ رے یہ وسعت آثارِ مدینہ
عالم میں پھیلے ہوئے انوارِ مدینہ
روشن رہیں دائم در و دیوارِ مدینہ
تا حشر رہے گرمیٔ بازارِ مدینہ
ہے شہر نبی آج بھی فردوس بداماں
جاری ہے وہی موسمِ گلبارِ مدینہ
پھرتے ہیں تصور میں وہ پُر کیف مناظر
تا حد نظر ہیں گل و گلزارِ مدینہ

اور یہ کلام ملاحظہ ہو :

الٰہی ! محبوبِ کل جہاں کو — دل و جگر کا سلام پہنچے
نفس نفس کا درود پہنچے — نظر نظر کا سلام پہنچے
بساط عالم کی وسعتوں سے — جہانِ بالا کی رفعتوں سے
ملک ملک کا درود اترے — بشر بشر کا سلام پہنچے
حضورؐ کی شام شام مہکے — حضورؐ کی رات رات جاگے
ملائکہ کے حسیں جلو میں — سحر سحر کا سلام پہنچے
زبانِ فطرت ہے اس پہ ناطق — بارگاہِ نبی صادق
شجر شجر کا درود جائے — حجر حجر کا سلام پہنچے

اور اصحاب سیدنا محمد (ﷺ) کو نذرانۂ عقیدت یوں پیش کرتے ہیں:

اصحاب محمد (ﷺ) حق کے ولی — ابوبکرؓ و عمرؓ، عثمانؓ و علیؓ
یارانِ نبی میں سب سے جلی — ابوبکرؓ و عمرؓ، عثمانؓ و علیؓ
وہ شمعِ حرم کے پروانے — وہ ختم رسل کے دیوانے
ابوبکرؓ و عمرؓ، عثمانؓ و علی — ابوبکرؓ و عمرؓ، عثمانؓ و علیؓ
اسلام نے جن کو عزت دی — اسلام کو قوت جن سے ملی
ایماں کی روایت جن سے چلی — ابوبکرؓ و عمرؓ، عثمانؓ و علیؓ
ترتیب خلافت بھی ہے یہی — ترتیب فضیلت بھی ہے یہی
لگتی ہے یہی ترتیب بھلی — ابوبکرؓ و عمرؓ، عثمانؓ و علیؓ

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور اہل بیت رسول (ﷺ) کی نسبت سے ان کے جذبات ملاحظہ ہوں:

جس قلب میں یارانِ نبی کی ہو عقیدت
کھلتے ہیں اسی قلب پہ اسرارِ مدینہ
معمور صحابہ کی محبت سے رہے گا
وہ سینہ کہ ہے مہبط انوارِ مدینہ
وہ آل محمدؐ ہوں کہ اصحاب محمد (ﷺ)
ہیں زینتِ دربار دُرر بارِ مدینہ
نسبت نہیں شاہوں سے نفیس اہل نظر کو
کافی ہے انہیں نسبتِ سرکارِ مدینہ

اسی طرح حضرت حسین رضی اللہ عنہ نواسۂ رسول اللہ (ﷺ) کے تذکرہ میں کہتے ہیں:

لایا جو خون رنگ دگر کربلا کے بعد
اونچا ہوا حسین کا سر کربلا کے بعد

پاسِ حرم ، لحاظِ نبوت، بقائے دیں
کیا کچھ تھا اس کے پیشِ نظر کربلا کے بعد
اے رہ نوردِ شوقِ شہادت ترے نثار
طے ہوگیا ہے تیرا سفر کربلا کے بعد
آباد ہوگیا حرم ربِ رسول (ﷺ) کا
ویراں ہوا بتول کا گھر کربلا کے بعد
ٹوٹا یزیدیت کی شبِ تار کا فسوں
آئی حسینیت کی سحر کربلا کے بعد
"قتلِ حسین اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد"

اور ایک بڑا بلیغ شعر ہے:

کلیوں پہ کیا گذر گئی ، پھولوں کو کیا ہوا
گلزارِ فاطمہ کی بہاروں کی بات کر

قومی شاعری کا نمونہ ملاحظہ ہو :

برطانیہ اچھا نہ فرنگی بہتر
لندن سے کراچی کا کورنگی بہتر
واللہ مرا اس پہ یقیں ہے کہ نفیس
گورے سے مرے ملک کا بھنگی بہتر

اور کہتے ہیں:

"مشرق سے ابھرتے سورج کو ذرا دیکھ"
پھر سر سے گذرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ
ہر روز سبق دیتا ہے عبرت کا یہ منظر
مغرب میں اترتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ

دنیا کی صورت حال کی عکاسی اس طرح کرتے ہیں:

کہاں دنیا کے فرزانے گئے ہیں
جہاں تک دیں کے دیوانے گئے ہیں
یہ دور ابتلاء !! ، استغفر اللہ !!!
بہت سے دوست پہچانے گئے ہیں

حضرت نفیس الحسینی صاحب اپنی اس سہ جہت خصوصیت وکمال کی بناء پر مختلف طبقات میں محبوب بن گئے تھے، ایک طرف وہ اہل ذوق حضرات تھے جو ان کی شاعری سے لطف لیتے تھے، دوسری طرف وہ حضرات تھے جو ان کے اخلاقِ عالیہ اور جذبۂ محبت اور تواضع کے گرویدہ تھے، تیسری طرف ان کا تصوف وارشاد بڑھتے بڑھتے ان کی خانقاہ کے قیام تک پہونچ گیا تھا، جس سے مسترشدین اور معتقدین اپنی اپنی پیاس بجھاتے تھے، اور اس طرح ان کی شخصیت ہمہ جہت سطح پر مقبول ہوگئی تھی ، اور ان کے پیش رو مرشدین عظام کے بتدریج کم ہوتے جانے سے مرکزِ ارشاد بن گئی تھی۔ لاہور میں ان کی خانقاہ آباد ہوئی، اور مرکز رشد وہدایت بنی، جہاں ان کے معتقدین جمع ہوتے اور استفادہ کرتے، جن میں اصحاب فضل وکمال اور اچھی حیثیتوں کے لوگ بھی ہوتے ، اور عوام الناس بھی۔ ان کو اپنے سے پہلے کے بزرگوں سے والہانہ تعلق تھا، اور ان کی نسبت سے برابر لوگوں میں ان کی عقیدت کی روح بیدار کرتے تھے، حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ سے بے پایاں محبت وعقیدت رکھتے تھے، حتی کہ ان کے نام سے ایک اکیڈمی بھی قائم کی، اور ان سے متعلق اور ان کے ملفوظات ومکتوبات پر مشتمل کتابیں شائع کیں ، جن میں خصوصیت سے "وقائع سید احمد شہیدؒ" قابل ذکر ہے۔ اس طریقہ سے انہوں نے حضرت سید صاحب سے اپنی بے پایاں عقیدت کا اظہار کیا۔

اسی تعلق سے اور اپنے شیخ ومرشد حضرت مولانا عبد القادر صاحب رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ کی نسبت سے وہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی بڑی محبت رکھتے تھے، اور ایسی محبت جس سے عقیدت کا اظہار ہوتا تھا، حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی بعض کتابیں جن میں خصوصیت

سے سیرت سید احمد شہید اور المرتضیٰ قابل ذکر ہیں، بڑے اہتمام سے شائع بھی کرائیں اور عام کیں۔

ان کی حضرت شہید اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمہما اللہ سے تعلق کے ضمن میں اس کاتب الحروف سے بھی شفقت و محبت کا تعلق تھا، جس کا مجھے علم غائبانہ بھی ہوتا رہا، اور ایک حج کے موقع پر (غالباً ۲۰۰۲ء میں) مکہ مکرمہ میں ایک ہی جگہ قیام کی سعادت بھی ملی، اور ان کی محبت کا اور تعلق کا فائدہ حاصل ہوا۔

اور انہی نسبتوں اور تعلق کی وجہ سے دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ سے انہیں تعلق تھا، اور اس ادارہ کے فرزندوں پر بھی شفقتیں فرماتے اور دعاؤں کا اہتمام کرتے تھے، اللہ تعالیٰ انہیں اس کی بہترین جزاء عطاء فرمائے، آمین۔

حضرت سید نفیس الحسینی صاحب کے ایک مسترشد جناب عتیق انور صاحب نے فون کے ذریعہ محبت گرامی مولانا حافظ فضل الرحیم صاحب لاہوری زید لطفہ (جو کہ جامعہ اشرفیہ لاہور اور اس کے ترجمان ''الحسن'' کے ذمہ داروں میں ہیں، اور رابطہ ادب اسلامی پاکستان کے صدر بھی ہیں) کی اس خواہش و ارادہ سے مطلع کیا کہ وہ الحسن کا خصوصی شمارہ حضرت شاہ نفیس الحسینی صاحب سے متعلق شائع کرنے جا رہے ہیں، اس کے لئے میں بھی کچھ تحریر کردوں، ان کی خواہش کے احترام میں اور حضرت شاہ صاحب کا حق سمجھتے ہوئے یہ تاثرات نذر قارئین کئے جا رہے ہیں۔

آخر میں اللہ تعالیٰ سے دعاء ہے کہ وہ حضرت سید نفیس الحسینی صاحب کی خدمات کو قبول فرمائے اور ان کے درجات کو بلند سے بلند تر فرمائے، آمین۔

☆☆☆

نعت

سالکؔ سید احمد برماور

بات نبی کی دین خدا کا، کل بھی تھا اور آج بھی ہے
رحمت رحمت خلد کا رستا، کل بھی تھا اور آج بھی ہے

رحمتِ عالم نے دنیا کو رحمت کا پیغام دیا
منہ بھر کے اس پیار کا چرچا، کل بھی تھا اور آج بھی ہے

غارِ حرا سے نسخۂ رحمت دنیا کے بیماروں کو
سچا سچا قول خدا کا، کل بھی تھا اور آج بھی ہے

طور طریقے غیروں کے راس آئیں تو کیسے راس آئیں
اسوۂ کامل پیارے نبی کا، کل بھی تھا اور آج بھی ہے

اپنی جان کے دشمن کو بھی جانِ کرم نے بخش دیا
پتھر پتھر پھول کا قصہ، کل بھی تھا اور آج بھی ہے

قسمت کے ہم اچھے تھے وہ نقشِ کفِ پا کام آیا
دور تلک گھنگھور اندھیرا، کل بھی تھا اور آج بھی ہے

گیسو و رخ کی سچی باتیں راحتِ جاں دیوانوں کو
نعتِ نبی رحمت کا ذریعہ، کل بھی تھا اور آج بھی ہے

صفحے صفحے پر تاریخ کے نوک پلک ہیں لاثانی
فتحِ مکہ کا وہ نقشہ، کل بھی تھا اور آج بھی ہے

وجہِ سکوں ہے ذکر ترا اے محسنِ اعظم صلِ علیٰ
والہ و شیدا سالکؔ تیرا، کل بھی تھا اور آج بھی ہے

☆☆☆

ہندوستان میں
عربی زبان میں فن سیرت نگاری کا ارتقاء

ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی
مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

سیرت نبوی اور انسانیت پر اس کا ناقابل فراموش احسان

ہندوستان میں ان مؤرخین اور قلم کاروں کی تعداد بے شمار ہے جنہوں نے سیرت نبوی کو اپنا موضوع بنایا، اور حضورِ اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ اور اُس کے خط و خال کو پوری امانت داری کے ساتھ محفوظ رکھنے کی کوششیں کیں، اور اس سلسلے میں حُسن تعبیر اور آپ کی سیرت مبارکہ کی سچی تصویر کشی اور اُس کی عکاسی کا زبردست التزام کیا۔ بلاشبہ یہ عظیم عمل دنیا کے مسلمانوں پر ایک بڑا احسان ہے، جسے فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ اس لئے کہ انہوں نے حضور اکرم ﷺ کی سیرت کی شکل میں ایک ایسا زندہ مرقع حیات پیش کیا ہے، جس میں لوگوں کو وہ باتیں بھی نظر آگئیں، جو اُن کے وہم وگمان سے پرے اور ان کے تصور وخیال سے بہت دور تھیں۔ اس سیرت طیبہ میں آپؐ کی ایسی ہمہ گیر و بے نظیر تصویر موجود ہے، جو الہام سماوی اور وحی الٰہی کی آئینہ دار ہے، کیوں کہ وہ آپ ہی کی ذات گرامی تھی، جس نے زمین کا رشتہ آسمان سے جوڑا، دین و دنیا کا حسین امتزاج پیش کر کے اہل باطل کے ایوانوں میں زلزلہ پیدا کر دیا۔ بُت پرستوں، نُجومیوں، کاہنوں اور اَوہام وخرافات کے اَسیروں کے عقائد پر ضرب کاری لگائی اور یہ اعلان کیا کہ خاکی صفت انسان ربُّ السماواتِ والأرض سے اپنا تعلق بلا کسی واسطے کے قائم کرسکتا ہے، اس راستے میں اُسے کسی سِفارش اور واسطے کی ضرورت نہیں۔

یقیناً حضور اکرم ﷺ کی رسالت اپنی ہمہ گیری و وسعت کے اعتبار سے ایسے پہلوؤں پر حاوی ہے، جن کے بیان کرنے سے زبان وقلم قاصر ہیں۔

سفینہ چاہیے، اِس بحرِ بے کراں کے لیے!!

بعثت نبوی سے قبل دنیا کا جو ماحول تھا، اسے دیکھ کر بڑے سے بڑا شخص بھی اس پیشین گوئی کی جرأت نہیں کرسکتا تھا کہ اس صفحۂ ہستی پر کوئی عظیم انقلاب برپا ہونے والا ہے، یا کسی نئی تبدیلی کا کوئی اِمکان ہے کیونکہ فساد اپنے عروج کو پہونچ چکا تھا۔ جس کی وجہ سے انفرادی واجتماعی زندگی کا نظام درہم برہم ہوگیا تھا، ہر شعبۂ حیات میں ظلم وستم، خوں ریزی وسفاکی، آوارہ گردی و بدچلنی اور اخلاقی انارکی کا دَور دَورہ تھا، شمس وقمر، زمین وآسمان ایک دوسرے کو حیرت سے تک رہے تھے، انسانیت دم توڑ رہی

تھی، الغرض پورا گلشن ارضی ماتم کدہ بنا ہوا تھا۔

لیکن چشم فلک نے دیکھا کہ محمد عربی ﷺ کے ذریعے دفعتاً ایک ایسا اِنقلاب آیا، جس نے ہر شخص کو اَنگشت بدنداں کر دیا، کیوں کہ اس سے انسانیت، شرافت، حیا و مروّت، خودداری و عزّتِ نفس اور اخلاقی قدروں کو نئے سرے سے زندگی ملی۔

یہ انقلاب انسانی تصورات اور مادی قیاس آرائیوں سے بہت دور تھا، اس نے ہر شخص کو حیران و ششدر کر دیا تھا۔

یہاں یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ اس انقلاب عظیم کا ظہور اس شخص کے ہاتھوں ہوا، جو ایک خاموش طبع انسان تھا، جو زندگی کی نیرنگیوں اور معاشرے کی بوقلمونیوں سے بہت دور تھا۔ وہ نسلی و قبائلی خانہ جنگیوں اور معاشرے کی معرکہ آرائیوں سے بالکل الگ تھلگ تھا۔

حضور اکرم ﷺ کی رحمۃ للعالمینی

جب میں آیت کریمہ: "وما أرسلناك إلا رحمة للعالمين" پر غور کرتا ہوں کہ اس میں آخری نبی کی بعثت کی شکل میں لفظ "رحمۃ" میں ایسا عموم ہے جو ساری کائنات کو اپنے جلو میں لیے ہوئے ہے تو بے ساختہ میں آپ ﷺ کو عالمی پیغمبر کہہ کر پکار اٹھتا ہوں، کہ آپ ﷺ ایسی رحمت لے کر اس دنیا میں تشریف لائے جس میں زمان و مکان کی کوئی حد بندی نہیں۔ فقیر و امیر کا کوئی امتیاز نہیں۔ شاہ و گدا کی کوئی تفریق نہیں۔ آپ ﷺ پر نازل شدہ کتاب کا وجود خود اپنی جگہ پر باعث رحمت ہے۔ ارشاد خداوندی ہے "وما أرسلناك إلا رحمة للعالمين" (ہم نے آپ کو سارے جہان والوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔) یہ کلام اس خلاقِ ازل کا ہے، جس کے فیصلے بڑے محکم، بڑے اٹل ہوا کرتے ہیں۔ اس میں تغیر و تبدل کی کبھی کوئی گنجائش نہیں۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی آفاقی رسالت

مذکورہ بالا نقطۂ نظر سے جب میں رحمت کے پیکر مجسم جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمہ گیر سیرت کا مطالعہ کرتا ہوں تو اپنے آپ کو آپ ﷺ کی توصیف بیان کرنے اور آپ کی ذات طیبہ میں موجود حقائق اجاگر کرنے سے قاصر پاتا ہوں۔

مختصراً یہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ عالم اپنے بقا و تسلسل اور اپنے تمام علمی و عملی، تمدنی و ثقافتی آثار کے وجود میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت طیبہ کا رہین منت ہے، اور انسانیت آپ ﷺ کی آفاقی رسالت اور ربانی دعوت کے احسانات کے نیچے دبی ہوئی ہے۔ کیوں کہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت نہ ہوتی تو آج کسی انسان کی عظمت و بلندی اور اس کی سرگرمی کا پتہ بھی نہ ہوتا۔ وہ کبھی ذلت کی بیڑیوں اور غلامی کی زنجیروں سے آزاد نہ ہو پاتا۔ شرک و بُت پرستی ظالمانہ طبقاتی نظام اور خاندانی و نسلی عصبیتوں سے اس کا دامن پاک نہ ہو پاتا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل و کرم سے بندوں پر احسان فرمایا، اور جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسم کو اس دنیا میں مبعوث فرمایا، اور زبان نبوت کے ذریعے برابری و مساوات کا یہ حسین درس دیا:

> "سارے انسان برابر ہیں، جس طرح کنگھی کے دندانے برابر ہوتے ہیں، کسی عربی کو کسی عجمی پر، کسی گورے کو کسی کالے پر تقوے کے علاوہ کسی اور چیز کے ذریعے کوئی برتری نہیں۔"

انسانی مساوات کی کارفرمائی

یہ اعلانِ نبوی اگر ایک طرف خودساختہ فخر و امتیازات کی بلند بام عمارت پر ضرب کاری تھا، تو دوسری طرف تمام بنی نوع انسان کے درمیان ایک ایسی مساوات کا اعلان تھا، جس کا مشاہدہ تاریخ انسانی نے پہلی بار کیا تھا۔ اسی کے ساتھ اس میں

رب کائنات سے تعلق پیدا کرنے پر تاکید بھی تھی۔ وہ یہ کہ انسان ہر چھوٹی بڑی بات، اہم وغیر اہم کام میں خدا ہی کا سہارا لے۔ کیونکہ وہ خدا کے تصور سے بیگانہ اور اس کے مراقبے سے بے نیاز ہو کر زندگی کی کوئی سعادت حاصل نہیں کر سکتا۔ سعادت کا اِنحصار تو صرف ربط الٰہی اور تعلق خداوندی پر ہے۔ لہذا انسان کو چاہئے کہ اس کا کوئی لمحہ ذکر الٰہی سے غفلت میں نہ گزرے۔ بلاشبہ انسان کا یہ تصور کہ اللہ کا علم ہر شے پر محیط ہے، اور وہ ہر بات سے باخبر ہے، اس کو تمام معاملات میں ایسا چوکنا اور محتاط بنا دیتا ہے کہ جس کا اثر اس کے فکر و عمل پر بھی پڑتا ہے۔ پھر اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ معاشرے کے اندر راحت و سکون، عدل و انصاف، امانت و دیانت، ایثار و خیر خواہی اور سچائی و راست بازی کے وہ مظاہر سامنے آتے ہیں، جن کا انسان طالب ہوتا ہے۔

حضور اکرم ﷺ کی سیرت نگاری میں مسلمانوں کا کردار

سیرت نبوی کے عُشاق اور اس سے محبت و تعلق رکھنے والے علماء، مؤرخین اور سوانح نگاروں نے ہر دور میں مختلف طریقوں سے اپنا اپنا خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

کبھی تو انہوں نے نثر کی شکل میں علم و ادب و تصنیف و تالیف کی شاخوں پر نغمہ سنجی کی، تو کبھی اشعار کے چمنِ سَدا بہار سے کلیاں توڑ توڑ کر اپنا دامن بھرا، سوز و گداز میں ڈوبے ہوئے نعتیہ کلام کہہ کر انہوں نے علم و ادب کے ایک ایسے بیش بہا خزینے اور گنجینے تک رسائی حاصل کی، جس نے ان کی سوزش محبت کو سکون اور مضطرب دل کو قرار بخشا۔

یقیناً سیرت نبوی پر دنیا کی ہر زبان میں نظم و نثر میں اتنا لکھا گیا کہ اس موضوع نے ادب کی ایک خاص صِنف ''فن سیرت نگاری'' کی شکل اختیار کر لی۔

اس صِنف میں مسلمانوں نے اپنے جذبات و احساسات کا اظہار ایسے والہانہ و عاشقانہ انداز سے کیا ہے، جس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔

سیرت نگاری میں مسلمانان ہند کا کردار

اس میں کوئی شک نہیں کہ فن سیرت نگاری سے وابستگی اور اس میں وسعت پیدا کرنے میں مسلمانان ہند کا بڑا اہم رول رہا ہے۔ انہوں نے اس موضوع پر ہندوستان کی مختلف زبانوں میں قلم اٹھایا اور بہت کچھ لکھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی منقبت میں انہوں نے بڑے دل آویز قصیدے کہے۔

یہ بات اپنی جگہ پر صحیح ہے کہ عربی زبان کے نعت گو شعراء کے مقابلے میں ہمارے ہندوستانی شعراء کی تعداد بہت کم ہے، تاہم اس بات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے کہ ہندوستانی علمائے کرام نے سیرت نگاری کے موضوع پر عربی زبان میں ایک گراں قدر ذخیرے کا اضافہ کیا ہے۔

دسویں صدی ہجری کے مشہور عالم شیخ عبد القادر بن شیخ حضری گجراتی (پیدائش: ۹۷۸ھ) نے اس موضوع پر عربی زبان میں متعدد کتابیں تصنیف فرمائیں۔ مثلاً:

(١) الحدائق الخضرة في سيرة النبي صلى الله عليه وسلم و أصحابه العشرة

(٢) إتحاف الحضرة العزيزة بعيون السيرة الوجيزة۔

(٣) المنتخب المصطفىٰ في أخبار مولد المصطفىٰ۔

(٤) المنهاج إلى معرفة المعراج۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ایک فاضل استاد ڈاکٹر صلاح الدین عمری نے اپنے ایک مقالے میں ہندوستان میں سیرت کے موضوع پر عربی قلم کاروں کا بہترین جائزہ پیش کیا ہے۔

معیار بحث بڑا علمی و تحقیقی ہے۔ "البعث الإسلامي" جلد ٤٢، شمارہ ٤ و ٥ میں اسے شائع بھی کیا گیا ہے۔

بیسویں صدی کے ہندوستانی علماء کی سیرت نگاری کا ایک مختصر جائزہ:

اس مختصر سے مقالے میں سیرت کی قدیم کتابوں پر بحث کرنا مقصود نہیں ہے، بلکہ موجودہ صدی کی بعض ان کتابوں کا مختصر تعارف پیش کرنے کا ارادہ ہے، جو عربی زبان میں لکھی گئیں، یا عربی ترجمے کے ذریعے منتقل ہوئیں۔

اس سلسلۃ الذہب کی سب سے پہلی کڑی مشہور سیرت نگار نبوی علامہ شبلی نعمانیؒ اور آپ کے نابغۂ روزگار تلمیذ علامہ سید سلیمان ندویؒ کی مایۂ ناز تصنیف "سیرۃ النبي" ہے۔ یہ کتاب سات ضخیم جلدوں میں دار المصنفین اعظم گڑھ سے شائع ہوئی ہے۔ عموماً ہندوستان کے سبھی علمی و ادبی حلقوں میں اس کی خوب پذیرائی ہوئی۔ اب تک اس کے کئی اڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے متعلق بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ یہ کتاب سیرت نبویؐ کے موضوع پر انسائیکلوپیڈیا کا درجہ رکھتی ہے۔ اس کی تلخیص خود علامہ سید سلیمان ندویؒ نے محاضرات (لیکچرس) کی شکل میں "خطبات مدراس" کے نام سے کی ہے۔

سید صاحب کے ایک لائق و فائق شاگرد مولانا محمد ناظم ندویؒ پاکستانی نے اسے عربیت کا جامہ بڑے سلیقے سے پہنایا ہے۔ اور "الرسالة المحمدية" کے نام سے وہ بھی اہل علم کے حلقوں سے خراج تحسین وصول کر چکی ہے۔

الرسالة المحمدية ایک جائزہ:

عربی زبان میں سیرت کے موضوع پر یہ ایک منفرد کتاب ہے، زبان و بیان انتہائی پرکشش، شستہ و شگفتہ، سلاست و روانی سے بالکل لبریز سیرت کے اہم اور قابل ذکر واقعات پر مشتمل علم و ادب، زبان و بیان اور معلومات کا نہایت حسین مرقع ہے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اُس کتاب کا ایک ادبی نمونہ پیش کر دیا جائے، تاکہ اس کی علمی، ادبی اور فنی امتیازات و خصوصیات کا اندازہ ہو سکے:

"إنّ الحياة المثالية لن تكون أسوة للناس مالم تكن أعمال صاحبها الذي يؤسس دينا و يدعو الناس إليه مثالا و أنموذجاً لمن يدعو إليه، ولايتطرق الشك إلى الناس بأن مايدعو إليه هو مما يعمل به ومن السهل أن يدعو الداعي إلىٰ فلسفة تحظى بإعجاب الناس و إلىٰ فكرة يستحسنونها أونظرية جديدة في الحياة تروق لهم، وكل ذلك مما يقدر عليه كثير من الناس متى شاء وا، و أين شاء وا۔ أما الذي لايستطاع دائماً فهو عمل الدعاة بما يدعون إليه۔

وليست الأفكار الصحيحة والنظريات الشائقة، والأقوال الحسنة هي التي تجعل الإنسان إنساناً كاملا، بل أعمال الداعي و أخلاقه هي التي تجعله كذلك، و لولاذلك لماكان هناك فرق بين الخير و الشر، ولما تميز المصلح عن غيره، و لامتلأت الدنيا بالثرثارين و المتفيهقين الذين يقولون مالا يفعلون۔"

(اردو اصل "خطبات مدراس" میں ملاحظہ ہو)

"رحمۃ للعالمین" مؤلف قاضی محمد سلیمان منصور پوریؒ:

علمائے اسلام کی صف میں خداداد صلاحیت کے مالک جناب مولانا قاضی محمد سلیمان منصور پوریؒ نے سیرت پر ایک

مفصل ضخیم کتاب اردو زبان میں تصنیف فرمائی۔ جس کا نام "رحمة للعالمین" رکھا۔

یہ کتاب علمی وادبی اور ثقافتی حلقوں میں ہاتھوں ہاتھ لی گئی۔ بلاشبہ یہ کتاب اس لائق تھی کہ اسے عربیت کا جامہ پہنایا جائے، تاکہ عربی زبان بولنے والے بھی اس کے مندرجات سے مستفید ہوسکیں۔

اس کے ترجمے کے ذکر پر مجھے قطر کے ایک ذی علم اور صاحب فضل عالم شیخ عبداللہ ابراہیم انصاریؒ کا ایک واقعہ یاد آگیا۔ وہ بیان فرماتے ہیں کہ:

"ایک مرتبہ ہندوستان کے سفر کے دوران میری ملاقات بمبئی میں صدیق مکرم فاضل گرامی مولانا مختار احمد ندوی سے ہوگئی۔ ان کے پاس میں نے ایک ضخیم کتاب کا نسخہ دیکھا، جس کا نام "رحمة للعالمین" تھا اور اس کے مصنف کوئی قدیم ہندوستانی عالم تھے، میں نے ان کے پاس موجود دو عالموں سے درخواست کی کہ براہ کرم میرے لیے کہیں سے تھوڑا سا ترجمہ کردیں۔ جب میں نے ترجمہ پڑھا تو اس کے مفہوم کی وسعت اور عبارت کی سلاست نے مجھے اپنا اسیر بنالیا۔ اور میری خواہش ہوئی کہ اس کتاب کو عربی میں مکمل منتقل کیا جانا چاہئے۔

میں نے اللہ سے استخارہ کیا اور اس سے مدد چاہی۔ اس کے بعد مولانا مختار احمد ندوی مرحوم نے دو فاضل عالموں کو ترجمے کے لئے مامور فرمایا، دونوں بحمد للہ بیک وقت عربی واُردو پر قدرت رکھتے ہیں۔

ان میں سے ایک کا اسم گرامی ڈاکٹر مقتدی حسن ازہری مرحوم، وکیل جامعہ سلفیہ بنارس، اور دوسرے صاحب کا نام مولانا عبدالسلام صاحب صدر شعبہ ترجمہ "الدار السلفیہ" بمبئی ہے۔"

ترجمے کے بعد یہ کتاب سیرت طیبہ کے موضوع پر بہترین دستاویز اور عربی سیرت نگاروں کے لیے ایک مستند مرجع کی حیثیت اختیار کرگئی۔ ترجمہ خود شگفتگی بیان اور حُسن تعبیر میں اپنی مثال آپ ہے۔ اس کی اہمیت وعظمت کا اندازہ پوری کتاب کے مطالعے سے ہوتا ہے، خصوصاً ہجرت کی داستان پڑھیئے اور سیرت نگاروں کی نگارش کا اندازہ لگائیے۔

حجة الوداع و عمرات النبي ﷺ

بقلم: شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ

یہ کتاب آپ ﷺ کے حجۃ الوداع اور عمروں کے بیان میں ہے، اس کے مصنف شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ ہیں۔ آپ نے عربی زبان میں اس کی تالیف فرمائی، پھر خود ہی اسے اردو میں منتقل فرمایا۔

اس کتاب کے تعارف کے لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے اس کتاب پر مقدمے کا ایک اقتباس نقل کردوں، تاکہ اس سے کتاب کی اہمیت و افادیت کھل کر سامنے آجائے۔ حضرت مولاناؒ رقم طراز ہیں:

"حدیث نبوی کی خدمت کے میدان میں ہمارے شیخ حضرت مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلویؒ اپنے تمام معاصرین علمائے کرام سے فائق وممتاز ہیں۔ درس وتدریس، تصنیف و تالیف، شرح وتخریج، تحقیق وجستجو آپ کا اوڑھنا، بچھونا ہے۔ آپ کی سب سے بڑی آرزو اور زندگی کی عظیم سعادت بس یہی ہے کہ آپ کے شب وروز خدمت حدیث میں بسر ہوں۔ آپ کی تمناؤں کا محور بس یہی ہے کہ حدیث نبوی اور سیرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ہر موضوع میں آپ کا حصہ وافر ہو۔

حدیث شریف سے گہری وابستگی اور اس فن سے طبعی مناسبت کی وجہ سے حجۃ الوداع اور عمرات نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر لکھی گئی کتابوں اور شروحات پر آپ کی نظر بڑی گہری ہے، اور آپ کو خوب معلوم ہے کہ اس موضوع پر قلم اٹھاتے وقت ایک مصنف کو کیا کیا دقتیں پیش آتی ہیں۔ اختلاف مسالک ان کے دلائل اور ان کی کیفیات بیان کرنے میں کتنی محنت درکار ہوتی ہے، حضرت شیخ چوں کہ اس میدان کے ایک کامیاب شہسوار تھے، اس لئے ۱۳۴۲ھ میں جب کہ آپ کی عمر صرف ۲۷ سال تھی۔ آپ نے اس موضوع پر مستقل ایک کتاب کی تصنیف کا بیڑا اٹھایا۔

چوں کہ اس موضوع سے متعلق تمام باتیں ذہن میں متحضر تھیں، اس لیے صرف ایک دن اور ایک رات میں کتاب کو پایۂ تکمیل تک پہونچادیا۔ آپ کے اس بابرکت عمل اور عظیم الشان کام کو دیکھ کر اسلاف کی یادیں تازہ ہوگئیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان بالکل سچ ہے۔: وماکان عطاء ربك محظوراً، (تمہارے رب کے عطیے پر کوئی پابندی نہیں۔)

السیرۃ النبویۃ:

مؤلف: حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ

اب میں سیرت کی ایک ایسی کتاب کا تذکرہ کرنے جارہا ہوں جو اصلاً عربی زبان میں لکھی گئی، بعد میں ''نبی رحمت'' کے نام سے اس کا اردو ترجمہ بھی ہوا۔ یہ کتاب صرف تاریخ وسیرت ہی کی کتاب نہیں، بلکہ وہ خالص علمی، ادبی و دل کش اسلوب بیان حسن انشا، اور فصاحت و بلاغت کی جیتی جاگتی مثال ہے۔ عصر حاضر میں فن سیرت نگاری میں اس کی نظیر نہیں ملتی ہے۔ یہ کتاب اپنی تمام معاصر کتابوں میں اس حیثیت سے ممتاز ہے کہ اس میں قدیم وجدید تمام مراجع کی کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے۔ اس میں علوم ومعارف اور حکمت وتربیت کے دونوں پہلو شانہ بشانہ جلوہ گر ہیں۔ اس میں ان واقعات کا بطور خاص احاطہ کیا گیا ہے جو زندگی میں جذبہ وولولہ اور ذوق کو مہمیز لگاتے ہیں، اور دل و دماغ کو اپیل کرتے ہیں، اور دل کی گہرائیوں میں اترتے ہیں۔

واقعات اس انسان کامل کے ہیں جن کی نظیر کسی دوسرے انسان کی زندگی میں ڈھونڈنا فعل عبث ہے۔

اس کتاب کے مقدمے میں مصنف علام خود تحریر فرماتے ہیں:

''جس شخص کا علم النفس اور اخلاقیات کے کوچے سے بھی گذر ہوا ہے، معاصر شخصیتوں کے مطالعے و مشاہدے کا اسے کبھی موقع ملا ہے، اور اس نے ایک طویل عرصہ ان کی رفاقت وصحبت میں گذرا ہے وہ بآسانی اندازہ کرسکتا ہے کہ نفس انسانی کی تہ تک پہونچنا، اور اس کے وسیع آفاق اور فضائے محیط کا علم، پھر اس کی جامع اور نازک تصویر کشی علوم ادبیہ اور اسالیب بیانیہ کی سب سے دشوار، نازک اور بہت جلد متاثر ہونے والی صنف ہے اور اس کا تھوڑا بہت حق وہی ادا کرسکتا ہے جو نفس انسانی کے احساسات و جذبات، اس کے سوز وساز، سرور وشوق، اس کی روح کی تپش اور دل کے گداز سے بہت کچھ واقف ہو، اور یہ محسوس کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو کہ اس کی راتیں کیسی کٹتی ہیں، اور اس کے دن کس طرح گذرتے ہیں، وہ اپنے گھر میں کیا نظر آتا ہے، اور اپنے رفقاء ودوستوں سے کس طرح پیش آتا ہے۔

اس نے اس کو صلح و جنگ میں بھی دیکھا ہو اور اشتغال و سکون، تنگی و راحت، اور ضعف وقوت میں بھی۔ اس لیے کہ انسان کے اندر بہت سے ایسے جذبات واحساسات اور اس کے جمال وکمال کے بہت سے ایسے نادیدہ وناشنیدہ پہلو بھی ہیں جن کے لیے انسانی لغت میں ابھی تک الفاظ وضع نہیں کیے جاسکے اور

جن کی منظر کشی وترجمانی کے لیے لغت کا بڑا سے بڑا ذخیرہ کفایت نہیں کرتا۔

بسیار شیوہاست، بتاں را کہ نام نیست

سیرت نبوی دوسرے افرادِ بنی آدم میں (بشمول انبیاء و غیر انبیاء) اپنی نزاکت ولطافت، وسعت وجامعیت، زندگی کی نازک سے نازک تفصیلات، اور دقیق سے دقیق معانی ومطالب اور دل کی دھڑکنوں اور پیشانی کی سلوٹوں اور نفس انسانی کی مختلف حالتوں کے احاطہ واستیعاب اور مکمل تشریح وترجمانی میں سب سے ممتاز اور بلند مقام رکھتی ہے۔

ایسا دراصل علم حدیث کی وجہ سے ممکن ہوسکا۔ جس کی کوئی نظیر دوسرے انبیاء یا تاریخ انسانی کی عظیم شخصیتوں میں کہیں نہیں ملتی، سیرت وشمائل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں، دن ورات کے مختلف حصوں میں آپ کے جواذکار اور خدا کے حضور آپ کی آہ سحرگاہی اور گریۂ نیم شبی اور اس امت اور پوری انسانیت کے لیے آپ کی بیقراری ودلسوزی کے جو عجیب نمونے آپ کے ادعیہ مسنونہ کے وسیع ذخیرے میں ہمیں نظر آتے ہیں، اس کو بھی اس میں بڑا دخل ہے۔

اسی طرح آپ کے اقوال ماثورہ اور جوامع الکلم، اور آپ کے باکمال وصف نگاروں اور اہل بیت کرام نے آپ کے جو شمائل وخصائل، عادات ومعمولات اور روزمرہ کی زندگی کے واقعات بیان کیے ہیں، ادبیات عالم اور تاریخ وانساب کے وسیع لٹریچر نے اس سے زیادہ نازک تصویر کشی اور منظر نگاری اور انسانی خدوخال اور اس کی اخلاقی بلندیوں اور لطافتوں کی اس سے عمیق اور عظیم ترجمانی اب تک ریکارڈ نہیں کی۔

اس لحاظ سے سیرت کی موضوع پر کتاب کی تصنیف میں کسی طرح کی دشواری اور ابہام، مفروضات قائم کرنے اور قیاس سے کام لینے کی بالکل ضرورت نہیں، جو مصلحین وقائدین کے تذکرے میں بہت پیش آتی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی سیرت ان میں سب سے زیادہ مکمل بھی ہے اور حسین بھی اس کی بنیاد قرآن مجید کے وہ صریح نصوص، تاریخ کی ناقابل تردید شہادتیں، آپ کا جمال صوری ومعنوی، شمائل وخصائل، عادات وعبادات اور اخلاق ومعاملات کی وہ واضح، روشن اور متعین تفصیلات وجزئیات ہیں، جن سے زیادہ کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ بایں ہمہ وہ حقیقت اور امر واقعہ سے بھی اتنی قریب ہیں جس سے زیادہ تصور ناممکن ہے۔

لیکن ان تمام باتوں اور رسول اللہ ﷺ کی سیرت طیبہ اور مصلحین عالم کے سوانح وحالات زندگی بلکہ خود دوسرے انبیائے کرام کی سیرت میں اس قدر فرق وتفاوت اور سیرت محمدی کی اس گیرائی اور ہمہ گیری اور جہاں آرائی کے باوجود جو کمال نبوت اور کمال آدمیت کی سدرۃ المنتہیٰ اور معراج ہے، ہم اس کا اعتراف کرنے پر مجبور ہیں کہ آپ کی زندگی اور مکارم اخلاق کی صحیح تصویر، اور آپ کے ان معجزات کا استیعاب وتفصیل، جن کی جلوہ ریزی آپ کی پوری سیرت ودعوت اور انفرادی واجتماعی زندگی میں نظر آتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں کے ساتھ آپ کا معاملہ، آپ کا حسن صورت وسیرت وکمال ظاہر وباطن، آپ کی محبت وشفقت اور دل داری ودل نوازی، آپ کی دعائیں اور خدا سے عرض حال، بنی نوع انساں اور انسانیت کے مستقبل کے لیے آپ کی بے قراری ودل سوزی، آپ کی فصاحت وبلاغت، علم وحکمت اور کمال وجامعیت کی ان روشن وجاں نواز نشانیوں اور زندہ ولافانی معجزوں کا مفصل ومکمل بیان قریب قریب ناممکن ہے۔

سیرت وشمائل کی کتابوں نے اس سلسلے میں جو کچھ پیش کیا ہے، وہ (ان کے کمال دیدہ وری وعرق ریزی کے اعتراف کے ساتھ) آپ کے جمال سیرت وکمال نبوت کا صرف ایک ہلکا سا

عکس ہے، جو اللہ تعالیٰ نے آپ ہی کے ساتھ مخصوص فرمایا تھا۔

زیادہ سے زیادہ اس کے متعلق یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ ان کی سعیٔ محمود ہے، کہ انہوں نے اس قدر ضبط واتقان اور غایت درجہ اہتمام کے ساتھ ان حالات کو قلمبند کیا اور اس کی بہترین جزاء اللہ تعالیٰ ان کو عطا فرمائے گا۔

یہ ایسی مشترک، عالم گیر اور غیر مختتم دولت ہے جس میں ہر فرد بشر، ہر انسانی گروہ ونسل اور ہر طبقہ ہدایت وروشنی اور اتباع و پیروی میں اپنا حصۂ رسدی پاسکتا اور اپنے طالع خفتہ کو بیدار کرسکتا ہے۔

لقد كان لكم في رسول الله أسوة حسنة لمن كان يرجوا الله و اليوم الآخروذكر الله كثيرا۔

(سورة الأحزاب:٢١)

تمہارے لیے اللہ کے رسول کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے، یعنی اس شخص کے لیے جسے خدا سے ملنے اور روز قیامت کے وقوع کی امید ہو، اور وہ خدا کا کثرت سے ذکر کرتا ہو۔

الرحیق المختوم، مؤلف: مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری

سیرت کے موضوع پر یہ عظیم الشان کتاب ہے۔ اس کا واقعہ یہ ہے کہ رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ نے ۱۹۷۶ء میں سیرت کے موضوع پر ایک مسابقے کا اعلان کیا، جس میں پانچ اہم مقالات منتخب کرکے ان کے لکھنے والوں کو ایک اچھی رقم بطور انعام دیئے جانے کا فیصلہ کیا گیا۔ مولانا صفی الرحمٰن مبارک پوری نے بھی اس میں حصہ لیا۔

آپ کی کتاب اس موضوع پر سب سے عمدہ اور مطلوبہ معیار وشرائط پر پوری اترتی ہوئی پائی گئی، لہذا اول انعام کی مستحق قرار دی گئی۔

بلاشبہ یہ کتاب موضوع سیرت کا ایک اہم مرجع ہے۔ اور علمی وتحقیقی میدان میں ایک نمایاں مقام کی حامل ہے، زبان و بیان، حسن تعبیر اور ادبی وفنی جمال کی منہ بولتی اعلیٰ تصویر ہے۔

یوں تو پوری کتاب جاذبیت و دل کشی سے لبریز ہے۔ لیکن اس کے اسلوب اور انداز بیان سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے صرف غزوۂ احد کا واقعہ پڑھ لینا کافی ہے۔

اس موضوع سے متعلق ایک اور کتاب

اس صدی کے اخیر میں اس عاجز (راقم سطور) کی کتاب "شعراء الرسول ﷺ في ضوء الواقع و القريض" بھی منصۂ شہود پر آئی۔

اس میں رسول اکرم ﷺ کے اصحاب میں سے چار جلیل القدر شعراء کی سوانح عمری اور ان کے کلام کا تذکرہ ہے۔

۱۔ شاعر رسول (ﷺ) حضرت حسان بن ثابت انصاریؓ۔

۲۔ حضرت عبداللہ بن رواحہؓ۔

۳۔ حضرت کعب بن مالکؓ۔

۴۔ حضرت کعب بن زہیرؓ (صاحب قصیدہ بُردہ) کے اشعار کا ادبی جائزہ لیا گیا ہے۔

اسی کے ساتھ نبی کریم ﷺ کے شعری ذوق، اشعار کہنے پر آپ کی ترغیب وہمت افزائی پر بھی کلام کیا گیا ہے۔

کتاب کا مقدمہ امام ربانی مفکر اسلام حضرت سید ابوالحسن علی ندویؒ کے قلم گہربار سے ہے۔ پیش لفظ جناب مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی نے لکھا ہے۔ دراصل یہ کتاب راقم سطور کی ڈاکٹریٹ (P.Hd.) کا مقالہ ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس حقیر کوشش کو قبول فرمائے۔ آمین۔

☆☆☆

مولانا مودودیؒ کی ''سیرت سرورِ عالم'' ایک جائزہ

ڈاکٹر عبدالعزیز عرفان

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ ایک معزز اور صوفی منش خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ۱۹۴۱ء میں جماعت اسلامی کا قیام ہوا اور اس کے امیر کی حیثیت سے مولانا کا انتخاب ہوا۔ اس کی بنیاد ترجمان القرآن کے دفتر لاہور میں رکھی گئی۔ اس کے ساتھ مولانا صحافتی سرگرمیوں میں مصروف ہو گئے۔ تفسیر القرآن، پردہ، تفہیم القرآن وغیرہ تصانیف تحریر فرمائیں، تقریباً ۱۱۴ تصانیف کا ذکر ملتا ہے، اس میں سیرت سرورِ عالم کا بھی شمار ہوتا ہے۔ اس کی دو جلدیں ہیں۔ آپ کی تصانیف سے اسلام کا ایک جامع تصور ابھرتا ہے آپ کی بدولت آج اسلامی علوم کا کثیر ذخیرہ اردو میں پایا جاتا ہے۔

سیرت پاک کے متعلق جو مضامین مختلف مقامات پر بکھرے ہوئے تھے۔ یہ مضامین تیس چالیس سال کے دوران مختلف مواقع پر لکھے گئے تھے۔ جناب نعیم صدیقی اور جناب عبدالوکیل علوی نے اس کو بہترین طریقے سے مرتب کر دیا۔ مقدمہ میں خود مولانا موصوف اس بات کا اقرار کرتے ہیں: ''میری دلی تمنا تھی کہ سیرت رسول پاکؐ پر بھی ایک کتاب لکھوں میرے دل میں اس کی حسرت ایک مستقل خلش بنی ہوئی تھی کہ یکا یک جناب نعیم صدیقی اور جناب عبدالوکیل علوی نے میری ہی مختلف کتابوں اور مضامین سے مرتب کیا ہوا مقالات سیرت کا یہ مجموعہ میرے سامنے لا کر رکھ دیا جسے دیکھ کر میں خود بھی حیران رہ گیا کہ اس عظیم الشان موضوع پر میری تحریروں میں اتنا کچھ مواد موجود تھا۔ اس کے ساتھ ہی ان دونوں حضرات کی اس محنت و جانفشانی پر بے اختیار دل سے داد نکلی اور دعائے خیر بھی کہ انھوں نے جگہ جگہ بکھرے ہوئے اس مواد کا نہایت باریک بینی اور تجسس کے ساتھ جائزہ لیا اور اس کو بہترین طریقے سے مرتب کر دیا۔ انشاء اللہ لوگوں کو رسول اللہ ﷺ کی شخصیت اور آپ کے کارنامۂ عظیم کو سمجھنے میں کافی مدد دیں گے۔''

اگرچہ مولانا موصوف کے یہ چیدہ چیدہ مضامین 'مقالات سیرت' مختلف مواقع اور اوقات میں تحریر کردہ ہیں لیکن مرتب شکل و صورت اختیار کرنے پر واقعی جداگانہ حیثیت کے حامل ہے وہ سیرت کے مختلف النوع مضامین اور پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے۔ سیرت کے ان ہی پیش کردہ پہلوؤں کا مختصراً جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

بقول مولانا موصوف اسلام کی نعمت ہر زمانے میں انسان کو دو ذرائع سے پہنچی ہے ایک اللہ کا کلام اور دوسرے، پیغمبران اسلام کی شخصیتیں، جن کو اللہ تعالیٰ نے نہ صرف اپنے کلام کی تبلیغ اور تعلیم کا واسطہ بنایا بلکہ اس کے ساتھ ہی عملی قیادت و رہنمائی کے منصب پر مامور کیا۔ تاکہ وہ انسانی افراد اور معاشرے کا تزکیہ کریں اور انسانی زندگی کے بگڑے ہوئے نظام کو سنوار کر اس کی تعمیر صالح کر دکھائیں۔ اس نئے دور میں انسان کو نعمت اسلام میسر آنے کے دو ہی ذرائع ہیں جو ازل سے ہیں۔ ایک خدا کا کلام اور دوسرے اسوۂ نبوت جو اب صرف محمد عربی صلعم کی سیرت پاک ہی میں محفوظ ہے۔ ہمیشہ کی طرح آج بھی اسلام کا صحیح فہم انسان کو اگر حاصل ہو سکتا ہے تو اس کی صورت صرف یہ ہے کہ وہ قرآن کو محمد ﷺ سے اور محمد صلعم کو قرآن سے سمجھے۔ ان دونوں کو ایک دوسرے کی مدد سے جس نے سمجھ لیا اس نے اسلام کو سمجھا ورنہ فہم دین سے بھی محروم رہا اور نتیجتاً ہدایت سے بھی۔ چونکہ قرآن اور محمد صلعم دونوں ایک مشن رکھتے ہیں اس لئے ان کو سمجھنے کا انحصار اس پر ہے کہ ہم ان کے مشن اور مقصد و مدعا کو کس حد تک سمجھتے ہیں۔ قرآن عبارتوں کا ایک ذخیرہ اور سیرت پاک واقعات و حوادثات کا ایک مجموعہ ہے جس سے آپ کی ذات مبارکہ اور آپ کے عہد کے متعلق معلومات کے

ذخیرہ کا اندازہ لگا سکتے ہیں مگر روح دین تک رسائی نہیں ہو سکتی۔ اس مقصد کا تصور جتنا صحیح ہوگا اتنا ہی قرآن اور سیرت کا فہم صحیح ہوگا۔ درحقیقت قرآن اور سیرت محمدی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام دونوں ہی بحر ناپیدا کنار ہیں، انسان ان کی مدد سے روح دین تک رسائی پائے۔

اللہ تعالیٰ ساری کائنات کا خالق اور مالک ہے۔ اس نے انسان کو پیدا کیا اسے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت عطا کی۔ اسے تصرف کے اختیارات بخشے اور ایک طرح کی خود اختیاری دے کر اسے زمین میں اپنا خلیفہ بنایا۔ اس منصب پر مقرر کرتے وقت اسے اس بات سے آگاہ کر دیا کہ تمہارا اور تمام جہان کا مالک، معبود اور حاکم میں ہوں۔ میرے سوا کوئی تمہاری اطاعت و بندگی اور پرستش کا مستحق نہیں۔ مجھے اپنا حاکم اور معبود تسلیم کرو۔ جو ہدایات میں بھیجوں، اس کے مطابق دنیا میں کام کرو اس کے برخلاف تمہارے لئے ہر وہ رویہ غلط ہے جو اس سے مختلف ہو۔ اگر اسے چھوڑ کر دوسرے راستہ پر چلو گے تو تمہیں دنیا میں فساد اور بے چینی کا مزہ چکھنا ہوگا اور عالم آخرت میں بھی ابدی رنج و مصیبت کے گڑھے میں پھینک دیے جاؤ گے، جس کا نام دوزخ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے جب یہ دیکھا کہ انسان صحیح طریقۂ زندگی سے منحرف ہو کر غلط راستوں پر چل رہا ہے تو اسے راہ راست کی طرف پلٹنے کی دعوت دینے کے لئے پیغمبروں کو مبعوث فرمایا۔ ہزاروں کی تعداد میں وہ مبعوث ہوئے۔ ان سب کا ایک ہی مشن تھا اور وہ تھا دعوت الی اللہ۔ اللہ تعالیٰ نے سرزمین عرب میں محمد ﷺ کو اسی کام کے لئے مبعوث فرمایا جس کے لئے پچھلے انبیاء کرام آئے، قرآن میں انبیاء کے مقصد بعثت کو ایک اور انداز سے بیان کیا گیا ہے:

"رسلاً مبشرین و منذرین لئلا یکون للناس علی اللہ حجۃ" (الآیۃ، ۱۶:۵)

یہ سارے رسول خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے بنا کر بھیجے گئے تھے تاکہ ان کو مبعوث کر دینے کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے مقابلہ میں کوئی حجت نہ رہے۔

اس کے ساتھ ہی غلبۂ دین کی جدوجہد کرنا بھی انبیاء کی ذمہ داریوں میں شامل ہے۔ ملاحظہ ہوں:

ھوالذي ارسل رسوله بالھدیٰ و دین الحق لیظھره علی الدین کلہٖ ولوکرِہ المشرکون۔ (التوبۃ: ۱۹۰)

وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ پورے طور پر دین کو غالب کر دے۔

واقعی انبیاء کرام کی بعثت کا اہم ترین مقصد بھٹکی ہوئی انسانیت کو راہ راست پر گامزن کرنا تھا۔ اللہ تعالیٰ حضور اکرم ﷺ کے مقصد بعثت کو بیان کرتے ہوئے واضح طور پر فرماتا ہے۔

ہم نے تم میں بھیجا ایک رسول تم میں سے کہ تم پر ہماری آیت تلاوت فرماتا ہے اور تمہیں پاک کرتا ہے "کتاب" اور پختہ علم سکھاتا ہے، جس کا تمہیں علم نہ تھا (سورہ بقرہ: ۲۰-۱۵۱)

کتاب پاک میں چار مقامات پر نبی ﷺ کے منصب رسالت کی تفصیل یوں بیان کی گئی ہے۔

ارشاد خداوندی ہے: وإذ یرفع إبراھیم القواعد من البیت و إسمٰعیل، ربنا وابعث فیھم رسولاً منھم یتلو علیھم آیٰتك و یعلمھم الکتٰب و الحکمۃ ویزکیھم۔ (البقرہ: ۱۲۹)

اور یاد کرو جبکہ ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ اس گھر (کعبہ) کی بنیادیں اٹھا رہے تھے (تو انہوں نے دعا کی) اے ہمارے پروردگار ان لوگوں میں خود انہی کے اندر سے ایک رسول مبعوث فرما جو انہیں تیری آیات پڑھ کر سنائے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے۔

کما ارسلنا فیکم رسولاً منکم یتلو علیکم آیٰتنا و یزکیکم ویعلمکم الکتٰب والحکمۃ و یعلمکم مالم تکونوا تعلمون۔ (البقرہ: ۱۵۱)

جس طرح ہم نے تمہارے اندر خود تم ہی میں سے ایک رسول بھیجا جو تم کو ہماری آیات پڑھ کر سناتا ہے اور تمہارا تزکیہ کرتا ہے اور تم کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور تمہیں وہ باتیں سکھاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے۔

لقد منّ اللہ علی المؤمنین إذ بعث فیھم رسولاً

من أنفسهم يتلو عليهم آيته و يُزكيهم و يعلمهم الكتٰب و الحكمة. (آل عمرا:١٦٤)

اللہ نے ایمان لانے والوں پر احسان فرمایا جبکہ ان کے اندر خود ان ہی میں سے ایک رسول مبعوث کیا جو انہیں اس کی آیات پڑھ کر سناتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

هوالذي بعث في الأميين رسولاً منهم يتلو عليهم آيته و يُزكيهم و يعلمهم الكتٰب و الحكمة. (الجمعه:٢)

وہی ہے جس نے امیوں کے درمیان خود انہی میں سے ایک رسول مبعوث کیا جو ان کو اس کی آیات پڑھ کر سناتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور ان کو کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

ان آیات میں بار بار تاکید فرمائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو صرف آیات قرآن ہی سنا دینے کے لئے نہیں بھیجا تھا بلکہ اس کے ساتھ بعثت کے تین مقاصد اور بھی تھے۔

۱۔ آپ لوگوں کو کتاب کی تعلیم دیں۔ ۲۔ اس کتاب کے منشا کے مطابق کام کرنے کی حکمت سکھائیں۔ ۳۔ آپ افراد کے ساتھ اجتماعی ہیئت کا بھی تزکیہ کریں۔ ساتھ ہی رسول بحیثیت شارح کتاب اللہ ہوتا ہے جیسا کہ سورۂ نحل میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وأنزلنا إليك الذكر لتبين للناس مانزل إليهم (آیت:٤٤)

اور (اے نبی) یہ ذکر ہم نے تمہاری طرف اس لئے نازل کیا ہے کہ تم لوگوں کے لئے واضح کرو اس تعلیم کو جو ان کی طرف اتاری گئی ہے۔

اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ نبی ﷺ کے سپرد یہ خدمت کی گئی تھی کہ قرآن میں اللہ تعالیٰ جو احکام ہدایات دے ان کی آپ توضیح وتشریح فرمائیں۔

ان بیانات سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ ہم رہنمائی کے لئے صرف ایک نبیؐ کی تعلیمات اور سیرت کے محتاج ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ صرف سرور عالمؐ کی سیرت اور تعلیمات محفوظ ہیں۔ جبکہ اس طرح کسی اور پیغمبر کی سیرت محفوظ نہیں۔ تاریخی طور پر محفوظ ہونا صرف رسول اللہ کی سیرت کا امتیاز ہے۔ دنیا کے کسی پیغمبر کی شخصیت کی سیرت کو تاریخی حیثیت حاصل نہیں ہے۔ ایسی شخصیت پوری دنیا کی تاریخ میں صرف حضور اکرمؐ کی ذات ستودہ صفات ہے۔

حضور اکرمؐ نے قرآن اس دعوے کے ساتھ پیش کیا کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ جو مجھ پر نازل ہوا ہے۔ اس میں کسی قسم کی آمیزش نہیں۔ یہ خالص کلام اللہ ہے۔ اس کے اندر اللہ کے سوا کسی دوسرے کا ایک لفظ بھی شامل نہیں ہے۔ آپؐ ہر نازل شدہ وحی کے متعلق کاتب کو یہ ہدایت بھی فرما دیتے تھے کہ اسے کس سورہ میں کس آیت سے پہلے اور کس کے بعد درج کیا جائے۔ اس طرح آپ قرآن کو ترتیب بھی دیتے تھے۔ یہاں تک کہ وہ تکمیل کو پہنچ گیا۔

قرآن، حضور اکرمؐ کی حیات طیبہ ہی میں چار طریقوں سے محفوظ ہو چکا تھا۔

۱۔ آپ نے خود کاتبین وحی سے اس کو از اول تا آخر لکھوایا۔

۲۔ صحابہ کرامؓ میں کوئی ایسا نہ تھا جس نے قرآن کا کوئی نہ کوئی حصہ، تھوڑا یا بہت یاد نہ کر لیا ہو۔ کیونکہ اسے نماز میں پڑھنا ضروری تھا۔ اور صحابہؓ کی تعداد کا اندازہ اس سے کر لیجئے کہ رسول اللہ کے ساتھ حج وداع میں ایک لاکھ چالیس ہزار صحابہ کرامؓ شریک تھے۔

۳۔ بہت سے صحابہؓ نے پورا کا پورا قرآن لفظ بہ لفظ یاد کر لیا تھا۔

۴۔ پڑھے لکھے صحابہؓ کی ایک اچھی خاصی تعداد نے اپنے طور پر قرآن کو لکھ بھی لیا اور رسول اللہ کو سنا کر اس کی صحت کا اطمینان بھی کر لیا۔

آج جو قرآن ہمارے پاس موجود ہے یہ لفظ بلفظ وہی ہے جسے حضور اکرمؐ نے کلام اللہ کی حیثیت سے پیش کیا تھا۔ یہ حضور اکرم کی شخصیت کا طرۂ امتیاز ہے۔ آپ کے سوا کسی نبی کو یہ وصف حاصل نہیں ہے۔ جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء کرام میں یکتا ہیں۔ آپ کی لائی ہوئی کتاب کی طرح آپ کی سیرت بھی محفوظ ہے آپ کی سیرت کے تمام گوشے روز روشن کی طرح واضح ہیں۔ جس سے ہم زندگی کے ہر شعبہ میں رہنمائی حاصل کر سکتے ہیں۔ بچپن سے لیکر آخر عمر تک جتنے لوگوں نے آپ کو دیکھا، آپ کے حالات زندگی دیکھے، آپ کے اقوال اور تقاریر سنیں آپ کی پسند

اور ناپسند کے متعلق سنا، انھیں سب نے یاد رکھا اور آئندہ نسل تک اسے پہنچایا، آپ کی وفات کے بعد صحابہؓ نے آپ کے حالات و واقعات اور اقوال تحریری صورت میں جمع کئے اور یہ ذخیرۂ علم ان لوگوں تک پہنچایا جنھوں نے بعد میں احادیث کو جمع اور مرتب کرنے کی خدمت انجام دی۔

مولانا مودودیؒ نے صحیح کہا ہے کہ دنیا کے کسی دوسرے انسان کے حالات اس طرح سے مرتب نہیں ہوئے ہیں۔ یہ خصوصیت صرف نبی کریم کو حاصل ہے کہ آپؐ کے بارے میں کوئی بات بھی سند کے بغیر تعلیم نہیں کی گئی اور سند میں بھی صرف یہی نہیں دیکھا گیا کہ ایک حدیث کا سلسلہ روایت رسول اللہ ﷺ تک پہنچتا ہے یا نہیں بلکہ یہ بھی دیکھا گیا کہ اس سلسلہ کے تمام راوی قابل اعتماد ہیں یا نہیں؟

غرض زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس کے متعلق آپ نے تفصیلی ہدایات نہ دی ہوں اور وضاحت نہ کی ہوں، مختصر یہ کہ آپؐ کی زندگی میں جامعیت ہے۔ آپ ہر کردار میں جلوہ گر ہوتے ہیں، عالم طفولیت تا دم مرگ جائزہ لیجئے، مجسم اخلاق کا پیکر نظر آتے ہیں۔ طفولیت میں برہنگی و بے حیائی سے دور نظر آتے ہیں ایمانداری، ہمدردی، امانت داری و پاسداری اور خلق و مروت کے چراغ روشن کرتے ہیں۔ واقعی آپؐ نے شاہراہ حیات پر بیش بہا نقوش چھوڑے ہیں۔ ارشاد خداوندی بھی ہے:

"لقد کان لکم فی رسول اللہ أسوۃ حسنۃ لمن کا یرجوان اللہ و الیوم الآخر۔" (سورۃ احزاب آیت ۲۱)

تمہارے لئے اللہ کے رسول میں ایک نمونہ تقلید ہے ہر اس شخص کے لئے جو اللہ اور یوم آخر کا امیدوار ہو۔

آپ کی سیرت کا ایک وصف اور خصوصیت عملیت ہے۔ آپؐ نے جو کچھ فرمایا اس کا عملی نمونہ خود اپنی سیرت کے ذریعے پیش کیا یعنی آپؐ نے جو کہا، پہلے خود اس کا عملی نمونہ پیش فرمایا۔ اس کی قدم قدم پر جھلکیاں حضور اکرمؐ کی سیرت پاک میں دکھائی دیتی ہیں۔

حضور اکرمؐ کا کردار بحیثیت شوہر بھی مثالی رہا ہے۔ آپؐ نے بیوی کے حقوق کی بھی وضاحت کی ہے۔ آپؐ نے فرمایا:

"لوگو! عورتوں کے حقوق میں میری نصیحت مانو کہ یہ تمہارے ہاتھوں میں ہیں۔ تم اس کے سوا کسی بات کا حق نہیں رکھتے۔ بے شک عورتوں کا تم پر اور تمہارا عورتوں پر حق ہے۔ ہاں ان کا حق تم پر یہ ہے کہ ان کے پہنانے اور کھلانے میں نیکی کرو۔"

آپؐ خود ازواج مطہرات کا خاص خیال رکھتے تھے۔ کسی کے ساتھ ناانصافی نہیں ہونے دیتے تھے۔ یہاں بھی ان کا حسن سلوک ایک مثالی شوہر کا تھا۔

اب ذرا آپ کی سیرت پاک کے پیغام پر نظر ثانی کریں کہ اس میں کونسی ہدایت ملتی ہے۔

۱) حضور اکرمؐ کا پیغام تمام انسانوں کے لئے ہے۔ سبھی انسان حضورؐ کی دعوت کے مخاطب ہیں چاہے وہ کسی رنگ و نسل اور زبان سے تعلق رکھتے ہوں۔ آپ کا مشن پوری انسانیت کی رہبری کرنا تھا۔ آپ اس دنیا میں سب کے ہادی اور رہبر بنا کر بھیجے گئے تھے۔ حجۃ الوداع کے موقعہ پر فرمایا تھا۔

"دیکھو تم سب ایک آدم کی اولاد ہو۔ خواہ کوئی عربی ہو یا عجمی، کسی کو کسی پر برتری نہیں۔ اگر کوئی کسی سے افضل و برتر ہوگا تو صرف احتیاط و خوف خدا کی بنیاد پر ہوگا۔"

"بہرحال آپ کے یہاں مساوات انسانی کا تصور پایا جاتا ہے۔ جس میں رنگ و نسل کے تعصبات کا بہترین علاج پوشیدہ ہے۔ آپؐ نے رنگ و نسل اور وطن کے امتیازات کو مٹا دیا ہے۔

مولانا موصوف نے امریکہ کے افریقی نسل کے باشندوں کا مشہور لیڈر میلکم اکس (Melcome-Ix) کا واقعہ بیان فرمایا۔ جو ایک زمانے میں گوری نسل کے خلاف کالی نسل کے شدید ترین تعصب کا علمبردار تھا اسلام قبول کر کے حج کو گیا۔ اس نے دیکھا کہ مشرق، مغرب، شمال اور جنوب ہر طرف سے ہر نسل کے لوگ، ہر رنگ اور وطن کے لوگ چلے آرہے ہیں اور احرام کا لباس پہن رکھا ہے۔ سب ایک ہی زبان میں لبیک کے نعرے لگا رہے ہیں۔ ایک ساتھ طواف کر رہے ہیں۔ ایک امام کے پیچھے نماز پڑھ رہے ہیں۔ وہ پکار اٹھا کہ رنگ و نسل کے مسئلے کا صحیح حل یہی ہے نہ کہ وہ جو ہم اب تک کرتے رہے ہیں۔ مولانا موصوف آگے لکھتے ہیں کہ حج

کے علاوہ اگر کوئی شخص آنکھیں کھول کر اسلام کی تعلیمات کو بحیثیت مجموعی دیکھے تو کسی جگہ بھی انگلی رکھ کر یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ چیز کسی خاص قوم یا کسی نسل یا طبقے کے مفاد کے لئے ہے۔ یہ تو پورا کا پورا دین ہی اس بات کی شہادت دے رہا ہے کہ تمام انسانوں کے لئے ہے اور اس کی نگاہ میں سب انسان یکساں ہیں۔ اب ہمیں حضور اکرم ﷺ کے پیش کردہ انسانیت کی فلاح کے اصولوں پر نظر کرنی ہوگی۔ جس میں نہ صرف انسانیت کی فلاح پوشیدہ ہے بلکہ تمام انسانوں کو متحد کیا جاسکتا ہے اس کے چند اصول یہ ہیں:

(۱) اللہ کی وحدانیت کا وسیع ترین تصور۔ (۲) بندگی رب کی دعوت۔ (۳) اطاعت رسول ﷺ کی دعوت۔ (۴) خدا کے حضور جواب دہی کا تصور۔ (۵) حضور ﷺ کی ہدایت کا فیض۔

اس دنیا کا خالق اور مالک اللہ تعالیٰ ہی ہے اور ساری کائنات اسی کے قبضہ میں ہے۔ انسان مخلوق ہے۔ مخلوق ہونے کی حیثیت سے وہ اپنے خالق حقیقی کی بندگی کرے۔ یہی سیرت کا ایک نکتہ بندگی رب کی دعوت تھا۔ اس کے ساتھ ہی اطاعت رسول ﷺ کی دعوت بھی تھا۔ سورہ آل عمران میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: قل إن كنتم تحبون الله فاتبعوني يحببكم الله.....قل أطيعوا الله و الرسول فإن تولوا فإن الله لايحب الكفرين۔ (آیات: ۳۱-۳۲)

(اے نبی) کہو کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو اللہ تم سے محبت کریگا.. کہو کہ اطاعت کرو اللہ اور رسول کی، پھر اگر وہ منہ موڑتے ہیں تو اللہ کافروں کو پسند نہیں کرتا۔

آپ نے لوگوں کو یہ سکھایا کہ جس معاملہ میں حکم الٰہی ہو، اس کی بے چوں و چرا اطاعت کرو اور جہاں حکم الٰہی نہ ہو وہاں آزادئ رائے کا حق استعمال کرو۔ یعنی دوسری طرف آپؐ نے امت کو شوریٰ کے طریقے سے کام کرنے کی تربیت دی۔ یہ بات بھی بندگان خدا کو بتائی کہ تم خدا کے سامنے جوابدہ ہو۔ آپؐ نے خدا کے حضور جوابدہی کا تصور پیش کیا۔ تم اپنی من مانی زندگی بسر نہیں کرسکتے ہو بلکہ تمہیں اپنی زندگی کے اعمال کا حساب اپنے خالق حقیقی کو دینا ہے۔ اس کی بازپرس ہوگی۔

اس طرح سیرت پاک میں بہت سی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ اس کے بارے میں آپؐ نے وصیت کی تھی: ''میں تمہارے لئے وہ چیز چھوڑے جارہا ہوں کہ جسے اگر تم نے مضبوطی سے تھامے رکھا تو کبھی گمراہ نہ ہوگے یعنی اللہ کی کتاب اور اس کے نبی کا طریقہ''

یہی طریقہ سیرت محمدی کہلاتا ہے ہمیں سیرت کا مطالعہ اور ان پر عمل کرنا بہت ضروری ہے۔ یہ سیرت تھی سرور عالم محمد ﷺ کی، سرور عالم کے معنی دنیا کا سردار ہوتے ہیں۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مولانا مودودیؒ نے اس سیرت کا نام ''سیرت سرور عالم'' کیوں رکھا؟

مولانا مودودیؒ نے وجہ تسمیہ کے متعلق چار شرائط کا ذکر کیا ہے مولانا موصوف فرماتے ہیں کہ کسی شخص کو دنیا کا لیڈر یا رہنما کہنے کے لئے سب سے پہلی شرط یہ ہونی چاہئے کہ اس نے کسی خاص قوم یا نسل کی بھلائی کے لئے نہیں بلکہ تمام دنیا کے انسانوں کی بھلائی کے لئے کام کیا ہو۔

دوسرے اس نے ایسے اصول پیش کئے ہوں جو ساری دنیا کے انسانوں کی رہنمائی کرتے ہوں۔ تیسرے اس کی رہنمائی کسی خاص زمانے کے لئے نہ ہو بلکہ ہر زمانے میں ایک 'مفید' یکساں صحیح اور قابل پیروی ہو۔ چوتھے یہ کہ اس نے صرف اصول پیش کرنے ہی پر اکتفا نہ کیا ہو بلکہ اپنے پیش کردہ اصولوں کو زندگی میں عملاً جاری کرکے دکھایا ہو اور ان کی بنیاد پر ایک جیتی جاگتی سوسائٹی پیدا کردی ہو۔

آپ حضور اکرمؐ کی زندگی کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ یہ کسی قوم پرست کی زندگی نہیں بلکہ انسانیت سے محبت رکھنے والے انسان کی زندگی ہے۔ جس نے اپنی پوری قوت دنیائے انسانیت کے اس بڑے مسئلے کو حل کرنے میں صرف کردی، جس سے تمام انسانوں کے سارے مسائل خود حل ہوجاتے ہیں۔ حضور اکرمؐ نے ۲۳ برس کی مختصر مدت میں لاکھوں انسانوں کو خدا کی حکومت کے آگے سر اطاعت جھکانے پر آمادہ کیا۔ یہ وہ کارنامہ ہے جسکی بنا پر محمد ﷺ کو سرور عالم یعنی سارے جہاں کا رہنما کہتے ہیں۔ سب سے بڑے رہنما ہیں۔

کند ہم جنس با.....

.....ایچ ایم یٰسین

نادیہ کی پیدائش کے وقت اس کے والد بلند شہر سے باہر کسی کام سے گئے ہوئے تھے کہ اسکی والدہ کو درد زہ (Labour Pain) شروع ہوگئے۔ اس کی بڑی ماں رحیمہ کچھ گھبرائیں تو لیکن ہمت والی عورت تھیں اس لئے فوراً اپنی پڑوسن اور عزیز دوست رکمنی سنگھ کے ذریعہ سے یہ سوچ کر کہ اکیلی ،بغیر مرد کے کہاں اسپتال کے چکر کاٹے گی خاندانی دایہ کو گھر پر ہی ولادت کرانے کے خیال سے بلا بھیجا۔ اب یہ نادانی تھی یا تقدیر کا لکھا کہ ان کی دیورانی دو توام بچیوں کو جنم دینے میں انتقال کر گئی۔ یہ دیکھکر دایہ بھی گھبرا گئی اور رکمنی بھی۔ لیکن بڑی اماں تو بہت ہمت والی تھیں اور دور اندیش بھی۔ انہوں نے یہ سوچ کر کہ ان کا دیور بغیر کسی عورت کے بھلا کیسے دو بچیوں کو پال سکیگا انہوں نے سہمی ہوئی دایہ کو راز دار بنا کر برسوں سے بے اولاد رکمنی کو خاموشی سے ان میں سے ایک بچی دے کر یہ کہہ کر رخصت کر دیا کہ لے اپنی گود ہری کر لے اور اسے پال لے۔

اب نادیہ پانچ سال کی تھی کہ اس کے والد کا انتقال ہوگیا۔ والدہ تو پہلے ہی گزر چکی تھی۔ رحیمہ اس کی بڑی ماں، جو اس کی والدہ کے انتقال کے بعد سے پال رہی تھیں۔ اس کے یتیم ہو جانے سے بہت پریشان ہوئیں اور ان کے دل میں نہ جانے کیسے کیسے وسوسے گھر کرنے لگے۔ مذہبی ہونے کے باوجود خدا کی شاکی ہونے لگیں اور اکیلے میں اس سے شکایت کرنے لگیں:

''اے خدا تو نے کیوں اس معصوم کے سر سے سایہ چھین لیا۔ ماں کو تو نے اس سے جنم دیتے ہی اپنے پاس بلالیا تھا۔ اب باپ سے بھی محروم کر دیا۔ تیری کائنات میں رب العزت یہ کیسا سلسلہ ہے؟ اور وہ ایسا ہی سوچتی رہتیں۔

ایک دن خواب میں دیکھا کہ ایک فرشتہ ان سے کہہ رہا ہے۔

''محترمہ آپ تو اتنی سمجھدار تھیں۔ خدا کی عبادت بھی کرتی تھیں، پھر اتنی جلدی کیسے شاکی ہوگئیں۔ کیا تمہارا رب اب تم سے مشورہ کر کے یہ دنیا چلائے؟ ارے اللہ کی بندی یہ اس کے کام ہیں اس میں دخل نہ دو تم جس طرح اس بچی کی پرورش کرتی تھیں کرتی رہو۔ اس نے تمہیں اپنی عاقبت بنانے کا موقعہ دیا ہے۔ بے ماں باپ کے بچوں کو پالنا، ان کے سر پر ہاتھ پھیرنا اس کو بہت پسند ہے۔ دنیا میں انسان کا یہی امتحان ہے کہ دیکھیں اپنی دنیا میں مگن رہنے والے بے ماں باپ کے بچوں کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں۔ دیکھتی ہو؟ کتنے ان کا مال کھا جاتے ہیں؟ لیکن کتنے انسان یتیموں کے لئے یتیم خانے بناتے ہیں۔ انا تھالیہ چلاتے ہیں۔ وہ خلوص دل سے ان بے ماں باپ کے

بچوں کو پالتے ہیں، تعلیم وتربیت کرتے ہیں ان پر اپنا پیار لٹاتے ہیں وہ اس کے بہت نیک بندے ہیں۔ وہ ان کو نوازتا ہے یہی نہیں ان کی اس نیکی کا اصل پھل ان کو ان کے مرنے کے بعد بھی جب تک یہ انا تھالیہ یا یتیم خانے چلتے رہیں گے ملتا رہے گا"۔ یہ ثواب جاریہ ہے۔ نجات یا نروان کا صحیح راستہ ہے۔

رحیمہ نادیہ کی بڑی ماں کی گھبراہٹ کے مارے آنکھ کھل گئی۔ چاروں طرف دیکھا کوئی نظر نہ آیا۔ اب ان کو دھیان آیا کہ وہ تو خواب دیکھ رہی تھیں۔ فوراً توبہ کی اور تہیہ کیا کہ اب کبھی ایسے خیال دل میں نہ آنے دینگی۔ اور ان کے رویہ میں ایسی تبدیلی اور نیکی پیدا ہوئی کہ لوگ سگی ماں سے بھی اپنی اولاد کے لئے ایسی توقع نہیں کر سکتے۔ کبھی کوئی سرزنش نہیں۔ ہر وقت شہد سے بھرے جملے۔ ہر برے بھلے کی تمیز سمجھانا۔ اسکی پڑھائی کا معقول انتظام۔ گھر کے کام کاج کی تربیت ان کا وطیرہ بن گیا۔ وہ اس کو ایک بہترین انسان اور ذمہ دار شہری بنانے میں لگ گئیں۔ پاس بٹھا کر بہت پیار سے سمجھاتیں۔

"دیکھ نادیہ بیٹی۔ انسان کو کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہیے جو خدا کی مرضی کے خلاف ہو"

"کیسے بڑی ماں؟"

"یعنی اپنے سے بڑوں کا ادب کرنا چاہئے۔ چھوٹوں سے پیار کرنا چاہئے۔"

"چاہے وہ جو ہوں۔ کیا جانوروں سے بھی؟"

"ہاں بیٹا۔ اپنے پرائے سب! تم نے سنا نہیں؟ با ادب بانصیب۔ بے ادب۔ بے نصیب"

"جی"

"اور کبھی جھوٹ نہیں بولنا چاہئے۔ چوری نہیں کرنی چاہئے۔ دوسروں کی چغلی نہیں کرنی چاہیے"

"مگر بڑی ماں۔ عورتوں کے پاس تو جب وہ ایک جگہ مل بیٹھتی ہیں تو دوسروں کی برائی اور عیب نکالنے کی گفتگو کے علاوہ دوسری بات ہی نہیں ہوتی۔"

یہ باتیں ہو ہی رہیں تھیں کہ انکی پڑوسن رکمنی سنگھ بھی آ گئی۔ اسنے بھی یہ سنا کہ چغلی کرنا بہت برا ہوتا ہے۔ پڑوسن نے بھی ہاں میں ہاں ملائی کہ واقعی عورتیں ایک دوسرے کے پیٹھ پیچھے بہت برائیاں کرتی ہیں۔

بڑی ماں نے کہا۔ "ارے بھائی یہ بہت بڑا گناہ ہے۔ ہمارے نبیؐ نے اسکو انسان کا گوشت کھانے جیسا بتایا ہے"

"توبہ بڑی ماں۔ اب میں ایسا کبھی نہیں کروں گی۔ میں نیک بنوں گی۔ اللہ اور اس کے بندوں سبکو راضی اور خوش کرنے والی بنوں گی"۔ پڑوسن نے کہا کہ اب وہ بھی بہت احتیاط برتے گی اور اپنی بیٹی سیما کو بھی سمجھائے گی اور اس نے مزید بڑی ماں کو چپکے سے یہ بھی بتلایا کہ سیما بھی اب شرارت نہیں کرتی بلکہ پوجا پاٹ میں دل چسپی لینے لگی ہے انہوں نے یہ بھی کہا کہ اب لوگ ہمارے ٹرانسفر کرانے کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ دیکھیے یہاں کب تک کا آب ودانہ ہے۔ کہاں جانا ہے معلوم نہیں۔

سیما اور نادیہ اس طرح الگ الگ پرورش پاتے رہے۔ بھولی بھالی نادیہ کا ہر ایک کے کام آنا۔ بڑوں کی خدمت، چھوٹوں سے پیار۔ اپنے ہوں یا پرائے۔ یہ اس کا شعار بن گیا۔ اب گھر کا سارا کام وہ سلیقہ مندی سے ضد کر کے خود کرتی۔ محلے کے بچوں کو خاص طور پر غریب بچوں کو پڑھاتی۔ کشیدہ کاری، ہنر مندی سکھاتی۔ نیک اور سچا انسان بننے کی ترغیب دیتی۔ ملک اور ملک واسیوں سے پریم کے درس پڑھاتی۔ مذہبی فرق کی نفی کرتی۔ اور لوگوں کو بھی وہ اپنے ایسے ہی خیالوں سے آگاہ کرتی رہتی وہ کہتی:

"مذہب تو اپنے دلوں میں ہے اسکا معاملہ تو بندے

اور خدا کے درمیان کا ہے۔ سرکارؐ نے تعلیم دی ہے۔ اگر تمہارا پڑوسی بھوکا ہے اور تم نے پیٹ بھر لیا تو تم ہم میں سے نہیں۔ بے گناہ قتل سے چاہے جس کا ہو منع فرمایا ہے۔ اس میں انھوں نے کب ہندو مسلم کی تفریق کی ہے ارے انھوں نے تو جانوروں کے ساتھ بھی پیار محبت اور ان کی خبر گیری کے لئے فرمایا ہے پھر انسان کے ساتھ انسان ناروا سلوک کیوں اور کیسے کر سکتا ہے؟ اسلام نے تو ہر مسلمان کو اچھا انسان بنانے کا درس ہی ہمیشہ دیا ہے۔"

ایک دن سیما نے بتایا کہ اس کے پتا جی کا ٹرانسفر جموں ہو گیا ہے اور وہ لوگ ایک ہفتہ کے اندر یہ شہر چھوڑ کر ٹرانسفر کی جگہ چلے جائیں گے۔ نادیہ میری دوست میری کوئی غلطی ہو تو معاف کرنا اب نہ جانے زندگی کب اور کہاں ملاقات کرائے۔ بہر حال میں خط لکھتی رہونگی

غرضیکہ ان ہی خیالات اور اصولوں کی آماجگاہ پر بڑھ پل کر نادیہ محلے کی نیک پروین بن گئی تھیں اور ان کی بڑی ماں کو اب ان کی شادی کرنے کی فکر تھی۔

اسی دوران نادیہ کی تعریف سن کر محلے کے ایک شخص نے ان کی بڑی ماں سے شادی کے لئے کسی لڑکے کا ذکر کیا۔ اسکی بڑی تعریف کی۔ پڑھا لکھا ہے۔ روزگار سے مضبوط ہے۔ آپ دیکھ لیجئے پسند آئے تو بات بڑھائی جائے۔ بڑی ماں نے دیکھا۔ گبرو جوان، کھلتا رنگ، مناسب قد۔ پرکشش چہرہ۔ پڑوسی کی باتوں پر بھولی بھالی سادہ لوح بڑی اماں نے بھروسہ کر لیا۔ زیادہ تحقیق بھی نہ کی۔ کہاں سے کرتی؟ عورت ذات۔ شوہر معذور و بیمار۔ اسکی پنشن۔ ان کی محلے کے بچوں کے ٹیوشن اور کچھ بھتیجی نادیہ کی مدد سے گھر ٹھیک ٹھاک چل جاتا۔ اللہ والوں کا جیون اور رہن سہن بھی سادہ ہوتا ہے اس لئے بہت طمطراق کی ضرورت نہیں ہوتی تو بہت سے فضول خرچے بھی بدل جاتے ہیں۔

غرضیکہ نادیہ کی شادی پڑوسی کے بتلائے ہوئے لڑکے سے بہت سادہ طریقہ پر کر دی گئی۔ اور نادیہ سسرال چلی گئی۔ اپنے شوہر ندیم کے ساتھ۔

مذہب سے بے حد وابستہ شریف لڑکی نادیہ سسرال والوں کی دنیا داری اور مذہب بیزاری سے شروع شروع میں تو بے حد پریشان ہوئی اسکو اڈجسٹ کرنا مشکل ہو رہا تھا لہذا اسنے اپنے کام سے کام رکھنا شروع کر دیا۔ اس نے دیکھا کہ اسکی سسرال والوں کو تلقین قطعی ناپسند تھی اس نے ان کو اچھائی اور نیکی کے بڑے درس دیئے۔ خدا کے خوف اور مرنے کے بعد کی زندگی میں حساب کتاب اور ناانصافی و حرام کاموں کی سزا کا پورا پیش کیا۔ مگر سب بے سود۔ اور اسی طرح دو تین برس گزر گئے۔

ایک دن ندیم کو دہلی کسی شادی میں مع فیملی کے جانا تھا۔ کہ دو ایک دن پہلے ایک پڑوسی سے جو ایک بدقماش آدمی تھا اس کا جھگڑا ہو گیا۔ نادیہ نے بچاؤ کرنے کی کوشش کی اس وقت تو وہ پڑوسی چلا گیا۔ لیکن اپنے دل میں اس نے ان دونوں کے خلاف زبردست کینہ اور بغض رکھکر ان کو نقصان پہونچانے کی سوچنے لگا اور جب اسکو یہ علم ہوا کہ ندیم اور نادیہ دو دن کے لئے دہلی شادی میں جا رہے ہیں تو اپنے ایک دوست سے مل کر جو کسٹم ایکسائز محکمہ میں ملازم تھا ایک اسکیم ان کو نقصان پہونچانے اور سبق سکھانے کی غرض سے تیار کر ڈالی۔

دہلی سے واپسی پر جیسے ہی نادیہ اور ندیم ٹرین سے اترے پلیٹ فارم پر ہی ندیم آگے آگے جا رہا تھا بھیڑ میں نادیہ پیچھے ہو گئی اور پیچھے آتی نادیہ کو کسٹم و ایکسائز کے انسپکٹر نے روک کر اٹیچی کی تلاشی دینے کو کہا۔ نادیہ بے چاری سہم گئی اس نے فوراً حکم بجا لا کر اٹیچی تلاشی کے لئے پیش کر دی اور ندیم کو پکارنے کے لئے آگے بڑھی۔ شرم و حیا کی پتلی بھلا زور سے آواز دے کر ندیم کو کیسے پکارتی وہ اٹیچی وہیں چھوڑ کر ندیم کی طرف لپکی انسپکٹر

بھی اس کے پیچھے لپکا اور کسٹم کے سپاہی نے اپنی سازش کے تحت اس کی اٹیچی میں چپکے سے منشیات کی چھوٹی سے پڑیا کپڑوں کے نیچے چھپادی۔ ندیم اور نادیہ واپس آئے، ان کے سامنے تلاشی ہوئی اور وہ پڑیا برآمد کرلی گئی۔ اور پوچھ تاچھ کے لئے ان کو تھانے لے آیا گیا اور نادیہ کے پاس سے منشیات برآمد ہونے کے جرم میں چالان کر کے جیل بھیج دیا گیا۔ مجسٹریٹ سے ضمانت ملنے پر نادیہ واپس آگئی۔ بہت شرمندہ اور بے بس اور اپنی بے گناہی کے باوجود وہ قانون کی مار پیشی اور مقدمہ جھیلتی رہی اور بالآخر اس کو دھوکے سے بنائے گئے ثبوت اور بناوٹی گواہوں کے جھوٹے بیان پر دوسال کی سزا ہوگئی اور وہ بے چاری ایک قیدی بنکر جیل پہونچ گئی۔ لیکن زنانہ بارک بالکل فل تھی تاہم کسی طرح اس کو وہاں اس امید پر اڈجیسٹ کیا کہ ہفتہ پندرہ دن میں کسی کے چھوٹنے پر گنجائش ہوجائے گی۔

لیکن اسے خدا کی قدرت کہیں یا حسن اتفاق کہ اس کے ایک ہفتہ کے اندر ایک اور قیدی عورت سیما ایک کیس میں اپنے جیٹھ کے بہکاوے میں آکر کچھ ثبوت مٹانے کے جرم میں دوسال کی سزا پاکر جیل میں آگئی اور اب دو قیدیوں کو رکھنا دشوار طلب تھا چنانچہ جیلر صاحب کے حکم سے دن میں بقیہ عورتوں کے ساتھ رہتے ہوئے صرف رات کو ایک تنہائی سیل میں ان کو سونے کی اجازت دے دی گئی۔

پہلے دن تو سیما اور نادیہ ایک دوسرے کو پہچان نہ سکے لیکن رات میں آپسی گفتگو میں دو پرانی سہیلیاں جیل میں اس ملاقات پر بہت حیران ہوئیں۔ جیل کی اس زندگی اور پابندیوں کا ایک ساتھ جھیلنا انہوں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔

انہوں نے بچھڑنے کے بعد سے اب تک کے سارے حالات ایک دوسرے سے بیان کیئے۔ سیما نے نادیہ سے پوچھا:

''اے بہن یہ تو بتلاؤ کہ تم سے کیا خطا سرزد ہوگئی جو کم بخت تم اس قید خانے میں آگئیں؟ تمہاری زندگی تو بالکل صاف ستھری تھی۔ بڑی ماں کے دیئے ہوئے سارے سبق تم کو ازبر یاد تھے اور تم ان پر چلتی تھیں۔ بالکل نیک اور شریف بن کر پھر یہ کیا؟''

''اے بہن کیا بتاؤں اسی شرافت نے ذلیل کر دیا۔ میری بچپن سے لے کر اب تک کی ساری ریاضت برباد ہوگئی۔ نیکی غارت ہوگئی۔ جان بوجھ کر کوئی گناہ کیا ہوتا تو اتنا افسوس اور شرمندگی نہ ہوتی۔ لیکن ہم کو تو ناکردہ گناہ اور کسی کم ظرف کے انتقام کی سزا کاٹنی پڑ رہی ہے۔ اور شاید یہی خدا کی مرضی ہے۔ مگر تم؟''

''اے بہن کیا بتاؤں اسی شرافت نے ذلیل کر دیا۔ میری بچپن سے لے کر اب تک کی ساری ریاضت برباد ہوگئی۔ نیکی غارت ہوگئی۔ جان بوجھ کر کوئی گناہ کیا ہوتا تو اتنا افسوس اور شرمندگی نہ ہوتی۔ لیکن ہم کو تو ناکردہ گناہ اور کسی کم ظرف کے انتقام کی سزا کاٹنی پڑ رہی ہے۔ اور شاید یہی خدا کی مرضی ہے۔ مگر تم؟''

''بہن مجھے بھی میری سیدھائی، ایمانداری اور بھولے پن نے پھنسا دیا۔ تمہاری بڑی ماں اور میری ماتاجی کے بڑوں کے ادب اور تعظیم کرنے کے درس نے یہ دن دکھائے ہیں۔ اور پھر اس نے کس طرح اپنے جیٹھ کے دھوکہ میں آکر انجانے پن میں کچھ ثبوت چھپانے کی سزا پائی ہے اور وہ بھی خود کے نہیں بلکہ دوسروں کے فائدے کے لئے''

ان دونوں کے مزاج میں پہلے سے ہی بہت یکسانیت تھی۔ اب دونوں کے حالات اور یکساں انجام سے

انہوں نے جیل میں وقت گزاری اور کچھ نیا کرنے کے لئے سوچنا شروع کیا اور بالآخر اس فیصلہ پر پہونچے کہ ان لوگوں کو اپنی روش اور دھرم سے نزدیکی کا شعار نہیں چھوڑنا چاہیے۔ جیل کی اس زنانہ بارک میں چونکہ مجرم کم اور ملزم زیادہ تھے اس لئے انہوں نے طے کیا کہ وہ اپنی زنانی بارک میں جہاں فرصت کے اوقات بہت ہیں چونکہ دیگر مستورات قیدیوں کو جن کے پاس مشقت نہیں ہے فرصت ہی فرصت ہے ان کو ست سنگ میں جوڑ ینگے اور ان کو دھارمک لکچر اور وعظ و نصیحت کرتے رہیں گے تا کہ ان کے مجرمانہ ذہن میں کچھ سدھار پیدا ہو سکے اور وہ ایک اچھے شہری بننے کے لئے سوچیں۔ میں اسلام کے بارے میں بتاؤنگی اور تم ہندو دھرم کے بارے میں بتلانا۔ اور اگلے دن سے انہوں نے اس پروگرام پر عمل شروع کر دیا۔ شروع شروع میں تو عورتوں نے زیادہ دل چسپی نہ لی، بارک کی بیس قیدیوں میں سے صرف تین چار ہی شامل ہوتی تھیں لیکن بعد میں ان کی تعداد میں اضافہ ہونا شروع ہو گیا۔ اور نادیہ اپنے مذہب کے حساب سے اور سیما نے اپنے دھارمک اصولوں کا تذکرہ کرنا شروع کیا جس میں ہندو مسلم قیدی عورتیں سب ایک ساتھ ہی بیٹھتیں اور ان کے لکچر سنتیں۔ اور پھر ان لوگوں کو ایسا لطف آنا شروع ہوا کہ بارک کے سارے زنانہ قیدی ہی نہیں بلکہ لیڈی وارڈن بھی ان میں شامل ہونے لگیں۔ رفتہ رفتہ انکا یہ پروگرام بہت پسند کیا جانے لگا اور اس میں شرکت کرنیکی مرد قیدیوں نے بھی خواہش ظاہر کی اور جیل کے افسران سے اسے زنانہ بارک کی بجائے سرکل کے باہر والے حصہ میں کرنے کی درخواست کی تا کہ جو بھی قیدی اپنی فرصت کے اوقات میں شامل ہونا چاہے وہ شامل ہو جائے۔ افسران کو بھی یہ تبدیلی بہت پسند آئی اور انہوں نے اجازت دے دی۔ ان کا خیال تھا کہ اس سے قیدیوں کی زندگی اور ذہن میں بدلاؤ آنے کے چانس ہیں۔ سیما اور نادیہ دونوں کا بولنے کا انداز بہت متاثرانہ تھا جس سے سننے والے کو بوریت بالکل نہیں ہوتی تھی۔

قیدیوں کے ملاقاتی جب آتے تو وہ بھی یہ سن کر بہت خوش ہوتے کہ جیل میں دو لیڈی قیدیوں کے ذریعہ یہ ایک نیا تجربہ کیا جا رہا ہے جو یقیناً بقیہ قیدیوں میں سے کچھ کی زندگی میں گناہ اور جرم سے پرہیز کا باعث ہوگا۔ اور اس ملے جلے ست سنگ سے ملک کی یک جہتی اور ہندو مسلم اتحاد کو تقویت حاصل ہوگی، تعصب مٹے گا، اور یہ مشترکہ پروگرام چلتا رہا۔

ایک دن جیلر صاحب آفس ختم کر کے جیل میں راؤنڈ لینے کے خیال سے نکلے تو یہ ست سنگ جاری تھا نادیہ بول رہی تھی۔ کچھ دیر خاموشی سے کھڑے وہ بھی سنتے رہے اور اس روحانی کیفیت کا مزہ لیتے رہے۔

نادیہ کہہ رہی تھی۔

''انسان کو اس خدا یا پرماتما نے دنیا میں اس لیے بھیجا ہے کہ وہ ایک دوسرے کے کام آئے۔ آپس میں پیار و محبت سے رہے۔ دنیا میں فساد نہ پھیلائے۔ دوسروں کے درد کو پہچانے۔ اس کو اپنا درد جانے۔ یہی اس کی تخلیق کا اصل مقصد ہے۔

درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لئے کچھ کم نہ تھے کرّوبیاں

اور یہ حال جب ہی ہو سکتا ہے جب آپ خدا کو پہچانیں۔ اس کے بتلائے ہوئے راستے پہ چلیں شیطانی وسوسوں اور نفسانی خواہشات سے بچیں۔ اپنے ذہن کو پاک صاف رکھیں۔ برے اور غلط خیالات سے گریز کا جذبہ پیدا کریں۔ کوئی بھی کام کرتے وقت یہ دھیان کریں کہ خدا آپ کو دیکھ رہا ہے۔ اسکو انسان کے اچھے برے سب کاموں کی خبر ہے اور اس زندگی کے بعد ایک اور زندگی آنے والی ہے جہاں سب کا حساب ہوگا۔ ہر ظلم کا بدلہ مظلوم کو دلایا جائیگا''۔

ایک اور دن جیلر صاحب نے سیما کو یہ درس دیتے ہوئے سنا:

"انسان کو بھگوان بننے کا شوق نہیں ہونا چاہیئے۔ وہ تو اگر سچے معنی میں پجاری ہی بن جائے تو بھی کافی ہے۔ اور خلوص کا کوئی دوسرا نام نہیں ہوتا۔ وہ جسے سب پسند کریں خلوص ہے۔ خلوص کو تو مخلص دل والے خود ہی جان لیتے ہیں اور کام کرنا آپ کی ڈیوٹی ہے۔ انجام کے لئے فکر مندی نہیں۔ اور دوسروں کے کندھوں پر چڑھ کر لمبے قد کا دعویٰ نہیں کرنا چاہیئے۔ اور کسی سے جھگڑا یا اس کے تئیں شبہ دلوں میں بدیر قائم رکھنے سے محبت دم توڑنے لگتی ہے۔"

یہ سب کچھ سن کر بہت سارے مرد اور لیڈی قیدیوں نے جیل سے رہا ہونے کے بعد ایسی زندگی بتانے کا عہد لیا۔ ادھر جیلر صاحب نے بھی اپنے ڈپٹی جیلر اور اسسٹنٹ جیلر سے مشورہ کیا کہ نادیہ جنہوں نے ہماری جیل میں قیدیوں کے سدھار کی کوشش کی ہے اور ان کی رہائی نزدیک آرہی ہے کیوں نہ نادیہ اور سیما کو 26/جنوری کے موقعہ پر زیادہ ریمشن دے کر رہائی کردی جائے تاکہ وہ یہ قومی جشن اپنے گھر والوں کے ساتھ منا کر اپنی اور ان کی خوشیوں کو دوبالا کرسکیں۔ سب لوگوں نے اس آئڈیا کو بہت پسند کیا۔ اور ان دونوں کو رہا کردیا گیا۔ ادھر سارے قیدیوں نے ان کی رہائی پر جیل میں ہی ان کے لئے ایک الوداعی پارٹی جیلر صاحب کی اجازت سے رکھ لی۔ جو جیل میں شائد اس طرح کی پہلی پارٹی تھی۔

نادیہ کو وقت سے پہلے رہا ہو کر گھر پہنچنے سے سب لوگ بہت خوش ہوئے۔ لیکن سیما جب اپنے پاپا کے گھر پہونچی تو وہاں ماحول کچھ اداس تھا چونکہ اس کے پاپا ممی ریٹائر ہو کر اپنے محلے والوں سے وطن جانے کے لئے ودائی لے رہے تھے سیما بیٹی کو اس طرح آزاد ہو کر گھر آنے پر سب لوگوں نے اسکو بہت مبارک جانا اور ماحول ایک دم خوشگوار ہو گیا۔

نادیہ اپنے گھر میں مست تھی بڑی اماں بھی ندیم کے یہاں ہی آگئیں تھیں۔ انہیں یا نادیہ کو یہ علم ہی نہیں تھا کہ رکمنی سنگھ اور اس کے شوہر ریٹائر ہو کر بلند شہر اپنے قدیم محلے اور گھر میں سیٹل ہو گئے ہیں اور سیما کے شوہر نے بھی اپنے بڑے بھائی کی اس حرکت سے جس کی وجہ سے اس کی بیوی سیما کو سزا ہوئی تھی ناراض ہو کر بلند شہر ہی میں اپنا کاروبار سیٹ کر لیا تھا اور اپنی سسرال سے رابطہ بنائے ہوئے تھا۔ جنہوں نے سیما کی آمد سے اس کو مطلع کردیا تھا۔

یہ دونوں خاندان سکون سے اپنی زندگی گزار رہے تھے کہ ندیم کے گھر میں طوفان بپا ہو گیا۔ نادیہ چھت پر کسی کام سے گئی تھی کہ نہ معلوم کس طرح نیچے گر پڑی اور سر میں شدید چوٹ لگنے سے بے ہوش ہو گئی۔ اسی حالت میں اسے بڑے اسپتال پہونچایا گیا۔ ادھر رکمنی سنگھ کو جب اس حادثہ کی خبر ملی تو اس نے بھی بڑی ماں اور ندیم کے گھر کا رخ کیا۔ سیما بھی یہ سن کر بہت بے تاب ہو گئی اور اس نے بھی ساتھ چلنے کو کہا۔ دونوں ایک رکشہ میں سوار ہو کر نادیہ کے گھر کی طرف جا رہے تھے کہ راستہ میں ایک کار نے ان کے رکشہ کو ٹکر ماردی جس میں رکمنی سنگھ اور سیما نیچے گریں۔ رکمنی سنگھ کو تو معمولی لیکن سیما کو شدید چوٹ سر میں لگی تھی جس سے وہ بے ہوش ہو گئی۔ رکمنی سیما کو لے کر فوراً بڑے اسپتال پہونچی۔ وہاں ندیم اور بڑی اماں نادیہ کو لے کر پہلے ہی پہونچ گئے تھے۔ رکمنی سنگھ کے رکشہ کے حادثے میں سیما کو بے ہوش دیکھکر ان لوگوں کو بھی بہت رنج اور پریشانی ہوئی۔ دونوں کے سروں میں چوٹ اور دونوں بے ہوش اس واقعہ سے رکمنی اور بڑی ماں دونوں کی حالت بہت خراب اور پریشان کن تھی۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کریں اسی کیفیت میں

بڑی ماں کے منہ سے نکلا۔ ''اے اللہ خیر کر''۔ اسی وقت ندیم اِمرجینسی سے روتا پیٹتا آیا اور ان دونوں کے دم توڑنے کی خبر ان لوگوں کو دی۔ بڑی ماں نے ندیم کے ذریعہ یہ منحوس خبر سن کر جذبات کی رو میں بہہ کر کہا۔ ''یا رب یہ کیا؟'' دونوں بہنوں کے ساتھ ایک سا حادثہ۔ دونوں سر کی چوٹ سے بے ہوش اور ایک سی حالت میں دونوں کی موت''۔ بڑی ماں کی یہ بات سن کر ندیم چونکا اور جن دو افراد کو اب تک الگ الگ ہندو اور مسلم جانتا تھا۔ آج بڑی ماں ان دونوں کو بہن کہہ رہی ہیں۔ ان حالات میں جذبات سے پُر، ذہنی اعتبار سے معذور اور جسمانی اعتبار سے مضمحل رکمنی بھی خود کو سنبھال نہ سکی اور برسوں سے سینے میں دبے اس راز کو یک لخت اگل دیا۔ ہاں بیٹا سیما میری اولاد ضرور ہے۔ میں نے اسکو روز اول سے پالا ضرور ہے لیکن اس نے میری کوکھ سے جنم نہیں لیا۔ میں تو بے اولاد تھی۔ یہ تمہاری بڑی اماں نے ہی نادیہ کی جڑواں بڑی بہن کو غم سے نڈھال ہونے کے باوجود ان کی ماں کے ولادت میں انتقال کے وقت یہ کہکر مجھے سونپ دیا کہ لے اپنی گود ہری کر لے اور اسے پال لے۔ انہوں نے ہندو مسلم کا فرق مٹا کر دوستی کا حق نبھاتے ہوئے مجھ بانجھ کو ماں بنا دیا۔ اور اب میرا بھی یہ دھرم بنتا ہے کہ ان دونوں کو جنھوں نے جنم ساتھ ساتھ لیا تھا اب مرتے وقت بھی ساتھ ساتھ رکھوں۔ الگ نہ کروں۔ میں بخوشی اجازت دیتی ہوں کہ آپ لوگ نادیہ کے ساتھ اسکو بھی دفن کر دو اور ان دونوں بہنوں کی قبریں ساتھ ساتھ یعنی پاس پاس بناؤ تا کہ اگر وہ زندگی میں ساتھ نہ رہ سکیں تو کم از کم مرنے کے بعد تو دنیا والے ان کو ایک ساتھ دیکھیں۔ آپ ان کے کتبوں پر لکھوا دینا۔ کند ہم جنس با..... یہ کہکر روتے روتے اس کی ہچکی بندھ گئی۔

نعت

بسمل، شیخ علی باشاہ

تھے جہاں خار وہاں پھول کھلانے آیا
وہ بیاباں کو گلستان بنانے آیا
تیرگی ظلم و جہالت کی مٹانے آیا
عدل و انصاف کی وہ شمع جلانے آیا
خوابِ غفلت سے وہ انساں کو جگانے آیا
اہلِ دنیا کو عذابوں سے بچانے آیا
ہے امیر اور گدا ایک بتانے آیا
اونچ اور نیچ کی تفریق مٹانے آیا
حق و باطل میں ہے کیا فرق بتانے آیا
شمعیں ایمان کی سینوں میں جلانے آیا
آگ نفرت کی دلوں سے وہ بجھانے آیا
پھول اخلاص و محبت کے کھلانے آیا
خدمتِ خلق کا جذبہ وہ جگانے آیا
جو تھے وحشی انہیں انسان بنانے آیا
نوعِ انساں کو خسارے میں جو دیکھا اس نے
کامیابی کی طرف ان کو بلانے آیا

☆☆☆

غزل گو شعراء کرام کی حمدیہ شاعری

.....فراغ روھوی

اردو شاعری میں دوسری اصناف سخن کی طرح حمد کی روایت بھی پائی جاتی ہے۔ حیرت اس بات پر ہے کہ اس صنف سخن کو جس بلند و بالا مقام پر آج ہونا چاہئے تھا، وہاں تک یہ نہیں پہنچ سکی ہے۔ اس کے برعکس نعت گوئی شہرت و مقبولیت کے بام عروج پر دکھائی دے رہی ہے۔ اخبارات و رسائل میں تواتر کے ساتھ نعتیہ کلام اور نعتیہ مضامین کی اشاعت جاری ہے۔ موقعے موقعے سے بڑے اہتمام کے ساتھ نعتیہ محفلیں بھی سجائی جاتی ہیں اور ہر سال دس بیس نعتیہ مجموعے بھی زیور طباعت سے آراستہ ہو کر شائع ہوا کرتے ہیں۔ نعتیہ ادب کی جہت میں یہ پیش رفت یقیناً رسول مقبول ﷺ سے بے انتہا عقیدت و محبت کا بین ثبوت ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں نبی کریم ﷺ کی ذات گرامی تمام نبیوں میں اعلیٰ و ارفع ہے اور منفرد و محترم بھی۔ کیوں کہ آپ خدا کے محبوب نبیؐ ہیں۔ حور و ملائک بھی آٹھوں پہر درود و سلام کا نذرانہ بھیجتے رہتے ہیں۔ درود و سلام کے نذرانہ کا یہ سلسلہ ازل سے جاری و ساری ہے اور ابد تک دراز رہے گا۔

اس حقیقت کے باوجود ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ تمام جہانوں میں سب سے عظیم اور برتر صرف اللہ تبارک و تعالیٰ کی ذات اقدس ہے۔ وہی تمام تعریف اور تعظیم کے قابل ہے کیوں کہ وہ تمام صفات کا مالک ہے جن کا شمار ہمارے بس میں ہے نہ احاطۂ تحریر میں! خدائے وحدہٗ لاشریک کی بڑائی میں ہم چاہے جتنا کچھ لکھ لیں، کم ہوگا۔ دراصل ذات باری محیط کل ہے اور محیط کل کی توصیف ایک بشر سے ممکن نہیں۔ اسی لئے قرآن حکیم میں آیا ہے کہ:

"اگر دنیا کے تمام درختوں کے قلم بنا دیئے جائیں اور سمندروں کے پانی کو روشنائی، پھر بھی ذات باری تعالیٰ کی مدح سرائی کا حق ادا نہیں ہوگا۔"

حمد گوئی کی راہ میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ نہ کسی بندش یا شرط کا سامنا کرنا پڑتا ہے، نہ کوئی مشکل آڑے آتی ہے اور نہ بھٹکنے کا کوئی خدشہ لاحق رہتا ہے۔ یہ راہ تمام حدود و قیود سے آزاد ہے اور آزاد فضاؤں میں مبالغہ آرائی تو کیا غلو بھی ناقابل گرفت ہوا کرتا ہے۔ تعجب ہے کہ حمد گوئی میں اس قدر چھوٹ حاصل ہونے کے باوجود اس سمت میں وہ پیش قدمی اور دلچسپی دکھائی نہیں دیتی جو نعت گوئی کی جانب دیکھنے میں آتی ہے جب کہ نعت گوئی میں مشکل مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس راہ میں بڑے ادب و احترام اور احتیاط کی شرط مقرر ہے۔ اسی لئے نعت کی دو دھاری تلوار سے مثال دی گئی ہے۔ یہاں ذرا بھی پاؤں پھسلا کہ گئے کام سے!

افسوس کا مقام یہ ہے کہ نعت گوئی میں وہ لفظیات و خیالات بھی نظم کئے جا رہے ہیں جن کو صرف حمد کے لئے مخصوص

ہونا چاہئے۔ بعض حضرات تو حمد اور مناجات کے فرق کا بھی لحاظ نہیں رکھ پاتے ہیں۔ حمدیہ کلام میں بھی دست سوال دراز کردیتے ہیں جو بالکل نامناسب عمل ہے۔ حمد میں صرف خالق اکبر کی ثنا خوانی مقصود ہوتی ہے۔ جب کہ مناجات میں ہم اپنی طلب اور مدعا بھی بیان کرسکتے ہیں اور رب ذوالجلال کی بزرگی اور قدرت کا اعتراف بھی! حمد کہتے وقت ان باریکیوں کو پیش نظر رکھنا اشد ضروری ہے تاکہ حمد کہ عظمت برقرار رہے۔ ہمیں خدائے برتر کی ثنا خوانی میں قطعی بخالت سے کام لینا نہیں چاہئے۔ حق تو یہ ہے کہ اپنی بساط سے بڑھ چڑھ کر اس کی مدح سرائی کا فریضہ ادا کرنا چاہئے۔

حمد گوئی کی روایت کو آگے بڑھانے اور اس کی ترویج و ترقی کے لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ کثرت سے حمد تخلیق کی جائے، تزک واحتشام کے ساتھ حمدیہ محفلیں منعقد کی جائیں اور اخبارات ورسائل کے مدیران معتبر قلم کاروں سے حمدیہ مضامین و مقالے بھی لکھوائیں نیز گاہے گاہے حمد نمبر بھی شائع کریں۔ جس طرح پاکستان میں اس کے فروغ کے لئے کوششیں جاری ہیں۔ تاکہ ہمارا حمدیہ ادب بھی دوسرے ادب پاروں کے بالمقابل بھرا پُرا دکھائی دے۔

اس حقیقت سے کسے انکار ہے کہ تنقید، ادب کے معیار کی تفہیم کا پیمانہ ہے۔ لیکن عقیدے کی شاعری میں اس پیمانے کا وہ زاویہ نگاہ نہیں ہونا چاہئے جو دیگر اصناف شاعری کے لئے متعین ہے۔ ہمارے ناقدین کا خیال ہے کہ حمد ونعت، منقبت، قصیدہ اور مرثیے کا تعلق چوں کہ عقیدے سے ہے اس لیے ایسی شاعری میں تغزل کا گزر ممکن نہیں۔ لہذا وہ تمام اصناف شاعری جن کا تعلق عقیدے سے ہے ناقدین کے دوٹوک فیصلے کا شکار ہو گئیں۔ ہمارے خیال میں اگر ادب عقیدت کے سمندر کو کھنگالا جائے تو اس میں بھی وجدان کی موجیں ٹھاٹھیں مارتی ہوئی دکھائی دیں گی اور اس وجدان کا بہاؤ تغزل کے بغیر ناممکن ہے۔ عقیدے کی شاعری پر ہی کیا موقوف! جہاں تک ہم سمجھتے ہیں کسی بھی صنف شاعری میں تغزل کے بغیر وجدانی کیفیت کا پیدا ہونا ناممکن ہے۔ دیکھا جائے تو دنیا کے تمام معاملات و موضوعات کی توصیف بلکہ بیان، حق کی صفات کا ہی بیان ہے۔ اس لئے صنف حمد کی وسعت کا بھی کوئی ٹھکانہ نہیں۔ اب شاعر کے تخیل کی پرواز اور فراست ودانائی پر یہ منحصر ہوا کرتا ہے کہ وہ عشق میں کس قدر غرق ہو پایا ہے اور محبوب جو ذات باری ہے اور محیط کل بھی، اس کے کس کس پہلو کو محسوس کر پایا ہے اور اپنی محسوسات کو لفظوں کے جامے میں کس حد تک ظاہر کرنے میں کامیاب ہوا ہے۔ یہ تعلق خاطر جذبے کی فضا جتنی گہری اور صادق ہوگی حمد بھی اتنی ہی بلیغ، کامیاب، پراثر اور فکر انگیز ہوگی۔

حمد کی صنف میں دیکھئے تو غزل کی صنف سے زیادہ بلاغت ہے۔ تغزل تو حمد کا حصہ بھی ہے اور وصف خاص بھی۔ اس لئے کہ غزل کی دنیا میں محبوب کو مبالغے کے ساتھ صنم یا خدا بنانا پڑتا ہے لیکن حمد کا موضوع ہی جمالیات کا منبع ہے۔ وہی تو حسن ازل ہے تو اس حسن کے بیان، اور اس کی صفات کے اظہار میں تغزل نہ آئے تو کیا آئے۔ شاعر کے سامنے تو جمالیات کا ایک پرنور سمندر رواں ہے اب اس کے فکر وفن کے دامن پر منحصر ہے کہ وہ اپنے دامن میں کتنا بھر لیتا ہے۔ البتہ عقیدے کی شاعری کے مرکزی خیالات میں یکسانیت اور ٹکراؤ ناگزیر ہے۔ ایسی شاعری میں بڑی شاعری کی تلاش کی بجائے افکار، احساسات، جذبات، وجدان، پیرایۂ اظہار اور نئے اسالیب کی دریافت کی جائے۔

روایت کی پاسداری مستحسن سہی، لیکن روایت کا اسیر ہو کر لکیر کا فقیر بن جانا کبھی قابل رشک نہیں ہوتا۔ کیوں کہ عقیدے اور تقلید کے حصار میں مقید رہنے سے شاعری میں تازگی کے امکانات کم ہو جاتے ہیں اس حقیقت کو روشن

خیال شعراء نے شدت سے محسوس کرتے ہوئے حمدیہ شاعری کو بھی نئے اسالیب سے آراستہ کیا ہے اور اپنے پیرایۂ اظہار کو ندرت بھی عطا کی ہے۔ ان کی نظمیہ اور غزلیہ شاعری میں تازہ کاری کی جو کیفیت پائی جاتی ہے وہ حمدیہ شاعری میں بھی محسوس کی جاسکتی ہے۔ حمد گوئی سے متعلق اتنی لمبی چوڑی تمہید باندھنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی ہے کہ آج کی حمدیہ شاعری کا جائزہ لیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ اُس کا مزاج کیا ہے اور کس نہج پر ہے۔ یہ دیکھنے کے لئے سب سے پہلے مغربی بنگال کی حمدیہ شاعری کا مطالعہ کرتے چلیں:

ہوا کے شانے پہ جو بشر کو اڑا رہا ہے
سمندروں میں جو کشتیوں کو ترا رہا ہے
جو ہو کے اوجھل نظر سے، جلوے دکھا رہا ہے
اندھیری شب میں بھی راستہ جو بتا رہا ہے
وہی خدا ہے، وہی خدا ہے

علقمہ شبلی

قادرِ مطلق نے انسان کو بھی کس قدر فکر و فراست اور قدرت سے نواز دیا ہے، کہ اب وہ بھی آسمان پر سفر کر رہا ہے۔ سمندروں کے سینے کو چیر کر جہاز رانی پر قادر ہے۔ شب تاریک میں بھی سفر طے کر رہا ہے اور نظر سے اوجھل نظاروں کو بھی دیکھ رہا ہے۔ ان سب کے پیچھے کس کی کارفرمائی شامل ہے سوائے خدا کے۔ اسی کا اعتراف اس بند میں شاعر نے کیا ہے۔

صبح تیری عطا، شام تیری عطا
کام کے بعد آرام تیری عطا

قیصر شمیم

کائنات میں کوئی چیز بے وجہ وجود میں نہیں آئی ہے۔ شام وسحر اس لئے خلق کی گئی ہیں کہ مخلوق تلاشِ رزق میں صبح سے شام تک مصروف رہے۔ تلاشِ رزق میں اس کا تھک جانا بھی فطری بات ہے اس لئے اس کے آرام اور سکون کے واسطے رات بھی وجود میں لائی گئی ہے تاکہ اس وقت وہ آرام کر سکے لیکن آرام اسے نصیب ہوتا ہے جسے وہ توفیق دیتا ہے۔ درج بالا شعر میں شاعر نے اسی مفہوم کو ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔

ترا جو ہو گیا، دن اس کا رات اس کی ہے
حیات اس کی ہے، یہ کائنات اس کی ہے

حلیم ثمر آروی

خدا اسے ملتا ہے جو خدا کی جستجو کرتا ہے اور اس جستجو میں راہِ عشق سے گزرنا پڑتا ہے جو خدا کو پالیتا ہے اسے سب کچھ مل جاتا ہے۔ یہ دن، یہ رات، یہ کائنات کیا، اس کی حیات کو بھی دوام حاصل ہو جاتا ہے:

شعلوں میں کون، کون ہے مچھلی کے پیٹ میں
عالم ہے تو، علیم ہے تو، رب ذو الجلال

احمد رئیس

یہ شعر تلمیحی شعر ہے۔ خدا عالم بھی ہے، علیم بھی اور کرشمہ ساز بھی۔ اس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو شعلوں میں بھی محفوظ و سلامت رکھا اور حضرت یونس علیہ السلام کو مچھلی کے پیٹ میں۔ اس شعر میں ربِّ ذوالجلال کی انھیں کرشمہ سازیوں کی طرف اشارہ کرنے کی کوشش کی ہے۔

کوئی معبود نہیں تیرے سوا اے اللہ
سر بہ سجدہ ہے ترے سامنے بندہ تیرا

علیم الدین علیم

شاعر نے درج بالا شعر میں ذاتِ باری کی وحدانیت کا اعتراف کرنے کی سعادت حاصل کی ہے۔ بے شک اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہی مسجود بھی ہے، اسی کے سامنے تمام مخلوق سر بہ سجدہ ہوا کرتی ہے۔

گلوں کو رنگ، بہاروں کو تازگی دی ہے
کلی کو حسن، نظاروں کو دل کشی دی ہے

محسن باعشن حسرت

شاعر نے یہاں مناظر فطرت کو موضوع سخن بنایا ہے۔ گلوں کے رنگ، بہاروں کی تازگی، کلی کے حسن اور کائنات کے نظاروں سے نہ صرف حظ اٹھانے کی کوشش کی ہے بلکہ عقیدت کے ساتھ اللہ جل جلالہٗ کی عنایات کا تذکرہ بھی کیا ہے۔

میں خطا ہوں، تو عطا ہے، میں زمیں، تو آسماں ہے
مری حیثیت ہے کتنی، ترا مرتبہ کہاں ہے

ضمیر یوسف

شاعر نے آقا اور غلام کے درمیانی فاصلے کو شعر میں نظم کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ نہ صرف اپنی حیثیت پہچانتا ہے بلکہ اپنے آقا کے بلند و بالا مرتبے سے بھی کماحقہٗ واقف ہے۔

جس میں کوئی شک نہیں وہ حق ہے تو
سچ تو یہ ہے قادر مطلق ہے تو
ذات لا محدود تیری، لازوال
تو ہے بے شک بے عدیل و بے مثال

ارشاد آرزو

ان چار مصرعوں میں شاعر نے فنکارانہ طور پر ذاتِ باری کی کئی صفات کا احاطہ کرنے کی سعادت حاصل کی ہے۔ یقیناً خداوند کریم برحق بھی ہے اور قادر مطلق بھی، اس کی ذات لامحدود بھی ہے اور لازوال بھی بے شک وہ بے نظیر بھی ہے اور بے مثال بھی۔

کیا حقیقت مری، میں فنا ہی فنا
تو بقا ہی بقا، تو کہاں، میں کہاں

فراغ روہوی

اللہ کی ذات لازوال ہے۔ اس کے سوا ہر شئے کو فنا کے دشت میں بکھر جانا ہے۔ بڑے بڑے پہاڑ بھی ایک دن ریزہ ریزہ ہو جائیں گے۔ مشتِ خاک کی حقیقت ہی کیا۔ شاعر اپنی اوقات اور حقیقت سے بخوبی آشنا ہے۔ اللّٰہ باقٍ من کل فانٍ پر اسے یقینِ کامل بھی ہے اور مکمل ایمان بھی۔

درج بالا اشعار مغربی بنگال کے نمائندہ شعراء کرام کے حمدیہ اشعار تھے۔ آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ ان اشعار میں عشق کا الاؤ بھی تیز ہے اور جذبات کا بہاؤ بھی۔ اب آیئے ہندوستان کے کچھ نمائندہ شعراء کے حمدیہ اشعار کا مطالعہ کرتے چلیں۔

مجھے تو نذر بھی کرنے کو کچھ نہیں اپنا
جبیں کی خاک تری، آستاں بھی تیرا ہے

مظہر امام

تمام نعمتیں خدا کی عطا کردہ ہیں۔ انسان کے پاس اپنا کچھ بھی نہیں ہے کہ وہ اپنے ربِ عظیم کی بارگاہ میں کچھ نذر کر سکے۔ نہ جبیں اس کی ہے نہ جبیں کی خاک اس کی نہ ہی وہ آستاں اس کا ہے جہاں وہ سر جھکاتا ہے۔ شاعر کو اپنی تہی دستی کا شدت سے احساس ہے۔ اسی احساس کو اس شعر میں اجاگر کیا گیا ہے۔

پیڑوں کی صفیں، پاک فرشتوں کی قطاریں
خاموش پہاڑوں کی ندا اللہ ہی اللہ

بشیر بدر

جس دن کائنات تخلیق ہوئی ہے، اسی دن سے کائنات کی ہر شے خواہ وہ جاندار ہو کہ بے جان، خالقِ حقیقی کی ثنا خوانی میں مصروف ہے۔ اسی بات کو شاعر نے شاعرانہ انداز میں یوں نظم کرنے کی کوشش کی ہے کہ پیڑوں کی صفیں ہوں کہ فرشتوں کی قطاریں یا خاموش پہاڑیاں سب کی زباں پر ایک ہی رٹ ہے۔ اللہ ہی اللہ، اللہ ہی اللہ کے ورد کا یہ سلسلہ ہمیشہ جاری رہے گا۔

ہاتھوں میں سجتے ہیں چھالے، جیسی تیرے مرضی
سکھ داتا، دکھ دینے والے، جیسے تیری مرضی

مظفر حنفی

بے شک رب قدیر کے فیصلوں کے سامنے بشر بے بس اور لاچار ہے۔اس کی مرضی کے آگے سر تسلیم خم کرنا ہی پڑتا ہے۔عیش و آرام اور آسائشیں عطا کرنے والا سکھ کی بجائے اگر دکھ سے دامن بھر دے یا صلے کی جگہ ہتھیلی پر صرف چھالے ہی سجا دے تو شکوہ نہیں کرنا چاہئے، بلکہ محبوب کی اس ادا کو بھی مسکرا کر گوارا کر لینا چاہئے۔شاعر نے اسی خیال کا اظہار اس شعر میں کیا ہے۔

منزلیں اس کی، مرادوں کا نگر اس کا ہے
پاؤں میرے ہیں، تقاضائے سفر اس کا ہے

مغنی تبسم

انسان مسافر ہے اور دنیا مسافر خانہ یعنی ایک اور سفر درپیش ہے۔حیات اس سفر کا ایک پڑاؤ ہے۔ہم اپنی مرضی سے اس سفر پر روانہ نہیں ہوئے ہیں۔نہ کوئی منزل ہماری ہے نہ مرادوں کا نگر ہمارا ہے۔ہم تو صرف حکم کے بندے ہیں۔خدا جس سمت چلا رہا ہے ہم چل رہے ہیں۔شاعر نے اسی بات کو اس شعر میں نظم کرنے کی کوشش کی ہے۔

سارے نغمے، ساری صدائیں تیری ہیں
میرے لبوں کی ساری دعائیں تیری ہیں

ممتاز راشد

کوئل کی کوک ہو کہ چڑیوں کی چہکار، دریا کی لہروں کا راگ ہو کہ آبشار کی سرگم، برسات کا سر ہو کہ ہواؤں کے گیت یا انساں کے لبوں کی دعائیں، سب ایک ہی کرشمہ ساز کی کرشمہ سازیاں ہیں جس نے ایک اشارے میں سب کو خلق کیا ہے۔ درج بالا شعر میں اسی مفہوم کو ادا کیا گیا ہے۔

سنگ در بھی ترا، شہرِ جاں بھی ترا
لب پہ اعجاز لفظ و بیاں بھی ترا

ظہیر غازی پوری

انسان کے پاس سب کچھ ہوتے ہوئے بھی اس کا اپنا کچھ نہیں ہے۔ساری عطائیں اللہ جل جلالہٗ کی ہیں۔وہ سنگِ در بھی جہاں ہم سر بسجدہ ہوا کرتے ہیں۔وہ شہرِ جاں بھی جس پر ہمارا کوئی اختیار نہیں۔لفظ و بیاں کا وہ اعجاز بھی جو ہمارے لبوں پر مچلتا رہتا ہے۔شاعر نے اس شعر میں اسی حقیقت کا اعتراف کیا ہے۔

سمجھ میں کچھ نہیں آتا کوئی مقام اللہ
عجیب ہے تری قدرت، ترا نظام اللہ

رؤف خیر

بشر کے اختیار میں نہیں کہ وہ ذات باری کے مقام یا مرتبے کو پہچان سکے۔وہ عظیم ہے، بڑی عظمت والا ہے۔اتنی عظمت والا کہ اس کا احاطہ ممکن نہیں۔اس کا مقام، اس کی قدرت، اس کا نظام ایک معمہ ہے جس کا حل بشر کی فکر و فہم سے بالاتر ہے۔اسی خیال کو اس شعر میں پرونے کی کوشش کی گئی ہے۔

سارے مکاں سے اونچا ہے لامکاں تمہارا
یہ سرزمین تمہاری، یہ آسماں تمہارا

مناظر عاشق ہرگانوی

اللہ تبارک وتعالیٰ تمام جہانوں کا خالق بھی ہے اور مالک بھی ہے۔وہ ہر جگہ قیام پذیر ہے۔یہ زمیں، یہ آسماں اور آسماں سے آگے لامکاں تک اسی کا قیام ہے۔وہ لامکاں جس کی وسعت اور بلندی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔وہ تمام مکانات سے وسیع اور بلند و بالا ہے۔اسی مفہوم کا اظہار اس شعر میں کیا گیا ہے۔

ترے ہاتھ موت وحیات ہے، ترے بس میں قید و نجات ہے
تجھے ذرے ذرے کی ہے خبر، تری شان جل جلالہٗ

علیم صبا نویدی

رب ذوالجلال کی دستِ قدرت میں کیا نہیں ہے۔ انسان کی موت وحیات بھی اسی کے ہاتھ میں ہے اور قید ونجات بھی۔ وہ بڑی شان والا ہے اور عالم الغیب بھی۔ وہ ذرّے ذرّے کی خبر رکھتا ہے۔ شاعر نے اس شعر میں شانِ کریمی کا اقرار اور اس قادرانہ وصف کا اعتراف بھی کیا ہے۔

تری ذات جس کو ثبات ہے، وہی جو کہ بالا صفات ہے
نہ شریک ہے، نہ سہیم ہے، تری شان جل جلالہٗ

مختار ٹونکی

اللہ جل جلالہٗ کی صفات میں ایک بہت بڑی صفت یہ بھی ہے کہ وہ لاشریک ہے یعنی یکہ وتنہا ہے۔ اس کا نہ کوئی ہم سر ہے نہ ساتھی وہ لازوال ہے اور ہمیشہ رہنے والا ہے۔ شاعر نے اس شعر میں ذات باری کی یکتائی کی قصیدہ خوانی کا شرف حاصل کیا ہے۔

خیر و شر تیری پناہوں میں خدا
تو ہی نغموں، تو ہی آہوں میں خدا

خورشید اکبر

رب کریم کی ذات اقدس بے شمار صفات کا مرقع ہے۔ وہ وحدت الوجود بھی ہے اور وحدت الشہود بھی۔ وہ دنیا کی ہر شے میں موجود ہے۔ ہر شے میں اسی کا پرتو دکھائی دیتا ہے۔ خیر ہو کہ شر اسی کی پناہوں میں ہے۔ وہ نغموں میں بھی نظر آتا ہے اور آہوں میں بھی۔ اسے دیکھنے اور محسوس کرنے کے لئے چشم بینا درکار ہے۔

ازل ابد ہیں سرود تیرے
نظام ہست اور بود تیرے

عطا عابدی

دنیا کے تمام معاملات وموضوعات ذات باری سے ہی منسوب ہیں۔ ازل کی گفتگو ہو کہ ابد کا بیان، نظام ہستی کا ذکر ہو کہ وجودیت کا تذکرہ سب کا مرکز ومحور ایک خدا کی ذات ہی تو ہے۔ اسی مفہوم کو شاعر نے اس شعر میں نظم کرنے کی کوشش کی ہے۔

آپ نے ہندوستان کے نمائندہ شعراء کے حمدیہ اشعار کے نمونے ملاحظہ فرمائے۔ ان اشعار میں بھی آپ نے عشق کی تیز آنچ محسوس کی ہوگی اور جذبات کی حرارت بھی۔ اب آیئے پاکستان میں حمدیہ شاعری کو کس طرح برتا جارہا ہے اور اس میں عشق کی کتنی گرمی ہے اور جذبات کی شدت نیز کس قدر انفرادیت پیدا کی گئی ہے، ملاحظہ فرمائیں۔

ممنون مرا دیدۂ بینا ہے کہ تو نے
دنیا کو دیا حسن تو مجھ کو بھی نظر دی

قتیل شفائی

رب عظیم کی نوازشات کا ہر وقت شکر ادا کرتے رہنا چاہئے۔ کیوں کہ اس نے ہمیں ہر شے سے مستفیض ہونے کی صلاحیت بخشی ہے۔ اس نے دنیا کو جہاں حسن و جمال سے نوازا ہے وہیں اس سے حظ اٹھانے کے لئے ہمیں اس نے نظر بھی عنایت کی ہے۔ وہ نظر جسے چشم بینا کہتے ہیں۔ شاعر نے اسی خیال کو اپنے شعر میں لفظی جامہ پہنانے کی سعادت حاصل کی ہے۔

رزق پہنچاتا ہے پتھر میں چھپے کیڑے کو
تو ہی سوکھی ہوئی شاخوں کو ہرا کرتا ہے

مظفر وارثی

رب کریم کی شان کریمی تو دیکھئے کہ وہ کہاں کہاں اپنے رزّاق ہونے کا ثبوت پیش کررہا ہے۔ وہ پتھروں میں چھپے ہوئے کیڑوں کو بھی رزق فراہم کرتا ہے۔ وہی سوکھی ہوئی ٹہنیوں کو پھر سے ہرا بھرا کرنے کی قدرت بھی رکھتا ہے۔ وہ سب کچھ کرگزرنے پر قادر ہے۔ شاعر نے اس شعر میں ذات باری کے انھیں اوصاف کا اعتراف کیا ہے۔

یہ ارض وسما، یہ شمس وقمر، سب تیرے ہیں، ہم تیرے ہیں
ہے نور کا عالم شام وسحر، سب تیرے ہیں، ہم تیرے ہیں

عشرت رومانی

زمیں سے آسماں تک، چاند سے سورج تک، دن سے رات تک اور نور سے خاک تک سب کے سب خدا کے غلام ہیں۔ سب اسی کے اشارے پر مصروفِ کار ہیں۔ خدا نے کائنات کو پر رونق بنانے کے لئے ایک ایسا نظام قائم کر رکھا ہے کہ یہ کائنات ہر وقت منور رہے۔ شمس وقمر کی تخلیق کے پیچھے یہی خیال کارفرما رہا ہوگا کہ اس خوبصورت کائنات میں کسی بھی لمحہ ظلمت کا غلبہ نہ رہے۔

گلشن عالم کی زینت کارفرمائی تری
کتنی دلکش ہے فلک پر بزم آرائی تری

افتخار اجمل شاہین

یہ زمین وآسماں اور تمام موجودات آئینے ہی تو ہیں۔ بے شک ان آئینوں میں خدا کا جمال جلوہ فگن ہے جنھیں صرف آنکھ والے ہی دیکھ پاتے ہیں۔ شاعر بھی آئینہ در آئینہ محبوب حقیقی کا جلوہ دیکھ رہا ہے اور اپنے دل میں اس کی شان یکتائی بھی محسوس کر رہا ہے۔

دریا پہ جب بھی چاہے وہ صحرا اتار دے
صحرا کو وہ نہ چاہے تو دریا بنائے کون

سہیل غازی پوری

رب قدیر کی قدرت کی کوئی انتہا نہیں۔ وہ چاہے تو دم بھر میں سب کی شکل وصورت بدل کر رکھ دے۔ وہ جب چاہے دریا کو صحرا بنا سکتا ہے اور جب چاہے صحرا کو دریا بھی کر سکتا ہے۔ یہ قدرت اس کے سوا کسی میں بھی نہیں کیوں کہ وہ قادر مطلق ہے۔

ازل کی صبح کا آغاز تیری خلاقی
ابد کی شام جہاں ہے وہاں کا مالک تو

غالب عرفان

خالق کل جہاں کی خلاقی بے مثال وبے نظیر ہی نہیں، ایک کرشمہ بھی ہے۔ وہ نہ صرف صبح ازل کا خالق ہے بلکہ شام ابد کی تخلیق بھی اسی کی کرشمہ سازی ہے۔ وہ ازل سے ابد تک کا خالق بھی ہے اور مالک بھی۔ ذات باری کے اسی وصف کو شاعر نے نظم کرنے کا فریضہ ادا کیا ہے۔

شہ رگ سے بھی قریب ہے سوچیں تجھے اگر
دیکھیں تجھے تو دور ہے، پانا محال ہے

شاعر علی شاعر

خدا پاس بھی ہے اور دور بھی، ہم اسے پانا چاہیں تو رسائی ممکن نہیں۔ کیوں کہ وہ ہمارے گماں سے پرے ہے۔ مگر تصور اور محسوس کیا جائے تو وہ شہ رگ سے بھی قریب تر ہے۔ بقول بشیر بدر۔

خدا ایسے احساس کا نام ہے
رہے سامنے اور دکھائی نہ دے

.....

خدا ترے کلام پر نہیں کوئی کلام
بڑا کلیم تو تجھے جچے کلیم لفظ

عبداللہ ساگر

خدائے کثیر الصفات کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ وہ بڑا کلیم بھی ہے۔ کلام پاک اس کا روشن ثبوت ہے۔ اس کے کلام سے بڑھ کر کوئی کلام نہیں۔ اس کا کلام بے مثال ولازوال ہے جس پر بشر سے کوئی کلام ممکن نہیں۔ لفظ کلیم اسی کی شایان شان ہے اور اسی کو زیب دیتا ہے۔ اس شعر میں اسی خیال کا اظہار کیا گیا ہے۔

کھلتے ہیں کہیں پھول، کہیں تپتی ریت ہے
تیرا کہیں جمال ہے تیرا کہیں جلال

ساحل سلطانپوری

رب العالمین رحیم بھی ہے اور کریم بھی، قہار بھی اور جبار بھی۔ وہ اپنے بندوں پر صرف رحم وکرم ہی نہیں کرتا۔ وہ جلال پر آجائے تو بندوں کو مصیبتوں میں بھی ڈال دیتا ہے۔ روز اول سے اس کے لطف وکرم اور جلال کا سلسلہ جاری ہے، کہیں سرسبز وادیوں اور خوش رنگ نظاروں کی صورت، تو کہیں آتش فشاں اور سلگتے ہوئے صحراؤں کی شکل میں۔ شاعر نے اسی خیال کو اس شعر میں پرویا ہے۔

جب تک کہ تو زباں کو نہ طاقت عطا کرے
بندے کی کیا مجال کہ تیری ثنا کرے

منظر ایوبی

ایک تو ذات باری کی توصیف بشر سے ممکن نہیں، دوسرے یہ کہ جب تک رب عظیم زباں کو طاقت گفتار نہ عطا کرے بندے کی کیا اوقات کہ اس کی ثنا خوانی کا حق ادا کر سکے۔ کیوں کہ بندہ عاجز بھی ہے اور قاصر بھی۔ اس شعر میں اسی حقیقت کا اعتراف کیا گیا ہے۔

مذکورہ اشعار نمونے اور مثال کے طور پر پیش کئے گئے ہیں۔ مختصر سے مضمون میں تمام غزل گو شعراء کرام کے حمدیہ اشعار کا احاطہ ممکن نہیں۔ سینکڑوں شاعر ہیں جنھوں نے تبرکاً ہی سہی ذات باری کی ثنا خوانی کا شرف اور سعادت حاصل کی ہے۔ حمدیہ شاعری کے لئے محبوب کے عشق میں ڈوبنے اور سرشار ہونے کی ضرورت ہے تبھی یہ صنف اپنے درجۂ کمال کو پہنچ سکتی ہے۔ ذات باری کا ذکر یا اس کی یاد کسی حوالے سے ہو اس کے فیض سے انسان کے قلب کا ہر گوشہ منور ہو جاتا ہے۔ خداوند تعالیٰ ہم سب کو اس کے ذکر کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

☆☆☆

نعت

رضوان فاروقی لکھنوی

جو بھی حق آشنا نہیں ہوتی
وہ زمیں کربلا نہیں ہوتی

جس میں رب کی رضا نہیں ہوتی
پوری ایسی دعا نہیں ہوتی

لاکھ دنیا تمہیں دعائیں دے
ماں سے بہتر دعا نہیں ہوتی

دنیا بھر کے قصیدے لکھتے ہو
رب کی حمد و ثنا نہیں ہوتی

ترقی کا دور ہے اس میں
ہے سبھی کچھ وفا نہیں ہوتی

شیشے جیسا لباس جو پہنے
اس میں شرم و حیا نہیں ہوتی

یہ فسانہ نہیں حقیقت ہے
ہر فنا کی بقاء نہیں ہوتی

کیفیت کے بغیر اے رضوانؔ
شاعری برملا نہیں ہوتی

☆☆☆

سیرت نگاری ادب اسلامی کے تناظر میں

مولانا عبدالرحمٰن ملی ندوی

سیرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رہتی دنیا تک کے لئے پوری انسانیت کے لئے مشعل راہ اور ہدایت انسانی کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے، سیرت رسول اللہ ﷺ حیاتِ انسانی کی ترقی و کامرانی دنیوی و اخروی فلاح و بہبود کی ضامن ہے، سیرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن فہمی کا معتبر ترین وسیلہ و ذریعہ ہے، قرآن کریم کے بعد انسانی قلب و ضمیر کو متاثر کرنے والا سب سے زیادہ حیرت انگیز ذریعہ سیرت رسول ہی ہے۔

اسی لئے ہر زمانہ اور تاریخ کے ہر دور میں چاہے وہ دور کتنا ہی صبر آزما اور پرفتن اور تاریک دور رہا ہو علماء اسلام اور راسخین علم نے سیرت نگاری اور سیرت سازی پر ہمیشہ زور دیا ہے اور اس کی اہمیت جانتے ہوئے نبوی ﷺ کو ایک موضوع بنا کر سیرت نگاری میں اپنی بہترین قلم کاری کا ثبوت بھی پیش کیا ہے۔

اور آپ ﷺ کی زندگی کے مختلف علمی زاویوں اور قولی و فرموداتی اصناف پر ادبی اعتبار سے قلم کاری کر کے ادب اسلامی کا زندہ ثبوت بھی پیش کیا اور اللہ کے رسول ﷺ سے اپنی غایت درجہ کی وارفتگی و محبت آپ کی ذات گرامی سے عشق حقیقی اور عملی تعلق بھی ثابت کیا ہے، اس لئے کہ سیرت نگاری کا فن غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے جس میں معمولی سی بھی جنبش اور لغزش عقیدۂ توحید و رسالت کو کہاں سے کہاں پہونچا دیتی ہے پھر مزید اس میں ادب اسلامی کی چاشنی پیدا کی جائے یقیناً یہ جگر گردے کی بات ہے۔

حضرات! اگر ہم اپنے قلب و ضمیر کو اس خوشی و مسرت سے آشنا کرنا چاہیں جو ہر غم سے بے نیاز کر دے، اور ذہن و دماغ کو اس روشنی سے منور کرنا چاہیں جو ہر اندھیرے پر غالب آجائے اور روح کو احساس طمانیت سے اس طرح لبریز کرنا چاہیں کہ روح پوری طرح آسودہ ہو جائے تو دانائے سبل، ختم الرسول کے ذکر جمیل سے بہتر اور کوئی طریقہ نہیں جس نے غبار راہ کو بخشا فروغ وادی سینا۔

انسانیت کی رشد و ہدایت کے لئے نبوت کا سلسلہ عرصہ دراز سے جاری تھا، پھر حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو مومنوں کے لئے شخصیت کے ہر پہلو اور زاویہ کی مکمل اصلاح و تطہیر، تزکیہ و تعلیم کے لئے مبعوث فرمائے گئے، آپ ﷺ نے انسانی عمل کا الہامی ضابطہ بخشا، جس سے اس کے قلب و ضمیر کا تزکیہ ہو جس سے گمراہ خواہشوں کو لگام پڑ گئی، صحت مند جذبوں اور مثبت قدروں نے دل میں گھر کر لیا گویا کہ سیرت سازی

انسانی تاریخ کا سب سے بڑا انقلاب ہے، یہ انقلاب چودہ سو سال قبل نمودار ہوا اور آج تک دلوں کو موہ لینی والی اثر انگیزی ظاہر کر رہا ہے۔

ہمیں خطبہ حجۃ الوداع کی شکل میں زندگی کا جامع منشور عطا ہوا، ہمیں عزت وشرف والی قوم بنایا گیا ہمیں اقوام عالم کی امامت کے لئے بنایا گیا تھا۔ سیرت نگاری جیسے اہم اور نازک موضوع پر ماہرین ومحققین نے عمدہ اور البیلے انداز سے یقیناً قلم کاری کی ہے لیکن یہ ایک ایسا فن اور موضوع ہے جس کے لکھنے میں اگر عقیدۂ توحید ورسالت صاف ستھرا نہ ہوتا تو بڑے بڑے شہسوار اس میدان میں مات کھا جاتے ہیں، اور قلم کی ذرا سی جنبش سے خطا ولغزش کے دلدل میں پھنس جاتے ہیں، لیکن اسی کے ساتھ ہمارے راسخ العقیدۃ اور صحیح الفکر مؤلفین و مصنفین نے اپنی نگارشات وتحریروں میں سیرت نگاری کا نہ صرف حق ادا کیا بلکہ ادب اسلامی کا لازوال اور عمدہ ترین نمونہ بھی پیش کیا۔

حضور پاک ﷺ کی مبارک زندگی ایسا بحر بیکراں ہے، کوئی سیرت نگار اور قلم کار چاہے وہ جتنا بھی ماہر قلم ہو دعوی نہیں کر سکتا کہ اس نے سیرت پاک کے بحر ناپید کنار کی تہہ سے تمام موتی اور جواہر نکال لئے ہیں، یقیناً یہ کام جوئے شیر لانے کے مرادف ہے، جس نے بھی اس باب میں قدم رکھا اور اس میدان میں لب کشائی کی اور اس سمندر میں غوطہ زنی کی تو سوائے حصول سعادت کے اور کوئی مقصد نہ تھا کتنے ہی متوالے ہیں جو اپنے گوہر بے بہا جوہر کدوں سے چن چن کر آستانۂ نبوت پر نچھاور کر رہے ہیں اور یہ سلسلہ ذہبیۃ انشاء اللہ رہتی دنیا تک جاری رہیگا، بقول مولانا منظور نعمانیؒ:

"کوئی مہینہ بلکہ غالباً کوئی ہفتہ اور کوئی دن بھی ایسا نہیں گذرتا جس میں اس مقدس موضوع پر کوئی کتاب کوئی رسالہ، یا کوئی مقالہ کہیں سے اشاعت پذیر نہ ہوتا ہو، اور ہونا بھی چاہئے تھا کہ "رفع ذکر" کی طے شدہ الٰہی تجویز ہے۔" "النبی الخاتم"

اکسفورڈ کا ایک عالم اس مبارک سلسلہ کا ان الفاظ میں اعتراف کرتا ہے محمد ﷺ کی سوانح نگاروں کا ایک وسیع سلسلہ ہے جس کا ختم ہونا غیر ممکن ہے۔

اردو میں سیرت نگاری کا ایک طویل سلسلہ ہے جس میں ہر دور کے علماء راسخین، محبین وعاشقین رسول نے اپنی اپنی علمی بساط کے اعتبار سے بھرپور حصہ لیا، جن کی کتابوں کی ایک لمبی فہرست بنتی ہے، جس کا ذکر یہاں ضروری نہیں بطور نمونہ چند ہی کا ہم تذکرہ کرتے ہیں، جیسے ماہر القادری کی منظوم تصنیف "ظہور قدسی" شمس العلماء خواجہ الطاف حسین حالی کی "مسد حالی" علامہ شبلی نعمانی کی "سیرۃ النبیؐ" حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ کی "سیرۃ خاتم الانبیا" ان کے صاحبزادے حضرت مولانا ولی رازی کی "ہادی عالم" حضرت مولانا اخلاق حسین قاسمی کی "وفات النبیؐ" مولانا ابوالکلام آزاد کے شاہکار قلم سے "رسول رحمت" اور "ولادت نبوی"، "مقالات سیرت" حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ "ذکر النبیؐ" حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب کے چند مضامین کا مجموعہ جس میں آپ ﷺ کے کمال وجمال اور نوال کو نہایت دلچسپ علمی انداز میں اجاگر کیا ہے، "رحمۃ اللعالمین" اور "سید البشر" حضرت مولانا قاضی محمد سلیمان صاحب منصور پوریؒ "خطبات مدراس" علامہ سید سلیمان ندویؒ "نشر الطیب فی ذکر الحبیب" حضرت علامہ تھانویؒ۔

ان کامیاب ترین مصنفوں اور مؤلفوں کی طویل فہرست میں ہم حضرت العلامہ حبیب العرب والعجم مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ کی مایہ ناز تاریخی

کتاب (نبی رحمت) کو بھی پاتے ہیں، جس میں نہ صرف سیرت نگاری کی گئی ہے بلکہ فصاحت و بلاغت کے جملہ اصناف کی پوری رعایت رکھتے ہوئے اللہ کے رسول ﷺ کی عملی وقولی زندگی کے تمام شعبہ جات پر قلم کاری کرتے ہوئے سیرت سازی کی بھی بھرپور دعوت دی گئی ہے اور ادب اسلامی کا اعلیٰ ومثالی نمونہ بھی پیش کیا گیا ہے، مصنف کتاب نے سیرت نگاری کے وقت اس ماحول اور اس عہد کو فراموش نہیں کیا جس میں نبوت محمدی کا آفتاب پہلی بار طلوع ہوا، اس زمانہ کی عالمگیر جاہلیت کی بھی اچھوتے انداز سے تصویر کشی کی ہے، ظہور اسلام کے وقت کے متمدن ملکوں اور اقوام عالم کی تاریخ بیان کی گئی ہے، اور منتشر حالات وواقعات کو اس طرح جمع کیا ہے جیسے چیونٹیوں کے منھ سے شکر کے دانے جمع کئے جائیں یقیناً یہ کام وہی شخص کرسکتا ہے جس نے یہ ایک طرف سیرت نگاری کے ساتھ ساتھ اپنی زندگی کو سیرت محمدی ﷺ کے سانچے میں ڈھالا بھی ہو اور دوسری طرف فصاحت و بلاغت اور ادب کی جملہ اصناف پر گہری نظر رکھتے ہوئے اپنی تحریر کو ادب اسلامی کا اعلیٰ شاہکار بھی بنایا ہو۔ جو اصلا عربی میں ہے جس کا دلنشیں انداز میں اردو ترجمہ حضرت مولانا ثانی حسنی کے قلم سے ہے۔ یہ کتاب ان چند کتابوں کے ناموں کو آخری فہرست قرار نہیں دی جاسکتی بلکہ ان آبدار موتیوں کے بارے میں چند ہی گوہر پاروں کے ذکر پر اکتفا کیا گیا ہے جن کے مؤلفین نے اپنی علمی وتاریخی تحریروں کو اصل وقائع واحوال کے ذکر کے ساتھ ادب اسلامی سے بھی مزین کیا۔

اخیر میں ناظم ندوۃ العلماء حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم کی خدمت میں ہدیۂ تشکر پیش کرتے ہیں کہ حضرت والا نے اتنے حساس اور قابل قدر موضوع کو اس سمینار کے لئے منتخب کرکے امت کو سیرت نگاری کے ساتھ ساتھ سیرت سازی کی بھی دعوت دی، ساتھ ہی ہم جامعہ اسلامیہ کاشف العلوم اورن گ آباد کے روح رواں اور ناظم اعلیٰ حضرت مولانا فاروقی صاحب مدظلہ العالی کے ممنون ومشکور ہیں کہ گرامی قدر نے ہمیں اس خوبصورت اور بارونق پروگرام میں شرکت کی دعوت سے مشرف فرمایا۔

☆☆☆

تمنائے حضوری

سید ضیاء الحسن ضیاؔ

ہے ارادہ کہ ہم اللہ کا گھر دیکھیں گے
مانگ کر ''پہلی دعاؤں'' کا اثر دیکھیں گے
بعد کعبہ کے چلے جائیں گے طیبہ نگری
حرم پاک کو واں بادیدہ تر دیکھیں گے
ہم مدینہ کے وہاں شام وسحر دیکھیں گے
اپنے اللہ کے محبوب کا گھر دیکھیں گے
کیسی گلیاں ہیں وہاں کیسے وہاں کے راستے
اپنے آقا کی ہر اک راہ گذر دیکھیں گے
جس جگہ ہوتی ہے انوار کی پیہم بارش
قبۂ نور پہ رحمت کا اثر دیکھیں گے
شوق کہتا ہے کہ ہم جلد مدینہ پہنچیں
شرم آتی ہے کہ کس منہ سے وہ در دیکھیں گے
کاش پہنچائے ضیاؔ کو بھی مقدر اس کا
راہ پُر پیچ ہے، مشکل ہے مگر دیکھیں

☆

پہلی مرتبہ ۱۹۹۹ء میں حج کو جانے سے قبل کے تأثرات۔

''ادب اسلامی کا'' نمائندہ شاعر

انتظار نعیم

قمر سنبھلی

اجالوں کے علم بردار رہیئے
بجھے مشعل تو خود تیار رہیئے

یہ شعر آج جس شاعر کی شناخت بن کر ادبی حلقوں میں گونج رہا ہے اس کا نام ہے انتظار نعیم ''ادب اسلامی'' کے نمائندہ شعراء کی جب بھی کوئی فہرست ترتیب دیجائے گی خواہ وہ کتنی ہی مختصر کیوں نہ ہو جناب انتظار نعیم کی شمولیت ناگزیر ہوگی انتظار صاحب نے صرف نعرے کے طور پر اسلامی ادب کا نام استعمال نہیں کیا بلکہ حقیقت میں ''اسلام'' ان کی روح کی گہرائیوں میں اتر کر ایسا رچ بس گیا ہے کہ کوئی میدان ہو ان کی کی رہنمائی کرتا نظر آتا ہے۔ چنانچہ ان کی شاعری میں بھی اسی کی روشنی پھیلی ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں موزوئی طبع کے ساتھ قوت اظہار کی دولت بھی عطا کی ہے اس لئے وہ پورے خلوص کے ساتھ اپنے افکار میں اسلامی روح کو پیش کرنے کا سلیقہ اور ہنر جانتے ہیں۔ اسلام صرف عبادات تک محدود نہیں بلکہ پوری انسانی زندگی کو محیط ہے اور ایک مکمل ضابطہ حیات اور طرزِ معاشرت کا حامل ہے۔ انسانی ضرورتوں اور اس کی زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جہاں اسلام رہنمائی نہ کرتا ہوں۔ صنفِ شاعری اس سے کیسے اچھوتی رہ سکتی ہے۔'' اسلام

> انتظار نعیم کو اہل زمانہ سے ایک یہ بھی شکایت ہے اور بالکل حق بجانب ہے کہ وہ کسی بھی تکلیف یا پریشانی کا تدارک بروقت نہیں کرتے۔ پریشان حالوں سے نظر چرا کر کترا جاتے ہیں۔ البتہ جب یہ دورِ ابتلا گزر جاتا ہے تو مسیحا بن کر منظر پر نمودار ہو جاتے ہیں۔

اور ادب'' لوگ خواہ مخواہ اس سے چونکتے ہیں اور بہت سے ادب کے حوالے سے اسے ''شجرہ ممنوعہ'' سمجھتے ہیں۔ حالانکہ اگر شاعر میں سلیقہ ہے تو وہ اس کی بنیادی روح کو مکمل طور پر ادبی شہ پاروں میں ڈھال سکتا ہے، صالح اقدار اور اس کی خوبیوں سے مزین کر کے اپنے افکار کو آفاقی وسعت عطا کر سکتا ہے۔

جناب انتظار نعیم ایک ایسے ہی باشعور، سلیقہ مند صاحب قلم ہیں۔ انھوں نے نظم و نثر دونوں میدانوں میں اپنے مثبت خیالات کے ذریعے ارباب فکر و نظر کو متوجہ کیا ہے۔ ان کی یوں تو کئی تصنیفات و تالیفات شائع ہو چکی ہیں مگر اس وقت ان کا تازہ شعری مجموعہ ''شرطِ وفا'' پیش نظر ہے اور فی الوقت وہی موضوع گفتگو ہے۔ انتظار صاحب کے اسی مجموعے میں غزلیں بھی ہیں اور پابند نظمیں بھی، قطعات بھی ہیں اور آزاد نظمیں بھی، اخیر میں نعتیہ کلام بھی۔ انتظار نعیم کی نظمیں بیشتر براہ راست اظہار کا انداز لئے ہوئے ہیں مگر غزل میں اس کی مخصوص ہیئت، ایمائیت و فنی نزاکت کو برقرار رکھتے ہوئے اپنی پاکیزہ خیالی اور مثبت فکر کے نمونے پیش کرنے میں آپ کامیابی کے ساتھ مصروف ہیں۔ نیز اپنے افکار کے ذریعہ اسلامی اجالے پھیلانے کی سعی مشکور کر رہے ہیں۔ اس تحریر کے آغاز میں دیا گیا شعر ان کے مشن کو پوری طرح ظاہر کر رہا ہے۔ شاعر ان اجالوں کی علم برداری کے لئے اس حد تک آمادہ ہے کہ اگر مشعل گل ہونے لگے تو روشنی کے لئے خود اپنی ذات کو شعلہ بنالے اور اجالوں کی بقا کی خاطر اپنے وجود کو داؤں پر لگانے کے لئے تیار ہے۔ اسلام کے لئے یہی پوری طرح خود سپردگی ایک اچھا انسان اچھا قلم کار اور ملک کا اچھا شہری بھی بناتی ہے۔ بلاشبہ جناب انتظار نعیم پوری طرح ان خصوصیات کے حامل ہیں۔ آج پوری ملت پے در پے جن امتحانات سے گزر رہی ہے اور جن حالات و مشکلات میں مبتلا کر دی گئی ہے اس پر انتظار نعیم ہراساں یا پریشاں تو نہیں مگر متفکر ضرور نظر آتے ہیں اور چوکنا بھی، ایسے ہی دشوار گزار مراحل اور مشکل حالات سے پوری ملت کو نکالنے اور اسے باوقار مقام دلانے کی فکر و تدبیر ان کی پوری شاعری کا محور ہے۔ دیکھئے ''دیوار'' کو ایک زبردست علامت کے طور پر استعمال کر کے غزل کی زبان میں کیسے ایک مختصر شعر کے اندر بڑے مضمون کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

یہ سنتی کم ، سناتی ہے زیادہ
ذرا دیوار سے ہشیار رہئے!

دیکھا! کس طرح پوری ملت کو لطیف انداز میں آنکھوں کے ساتھ دماغ کی کھڑکیوں کو بھی کھلا رکھنے کی تلقین کی گئی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ آج پوری قوم کو ''حواسہ خمسہ کی'' پوری بیداری کے ساتھ زندگی کے ہر شعبے میں اپنا مثبت کردار ادا کرنا ہے۔ جناب انتظار نعیم کو اپنے مظلوم بھائیوں کی مظلومیت اور محرومیوں کا احساس ہے۔ اسی کے ساتھ ساری دنیا میں ان کے ساتھ جو سلوک روا رکھا جا رہا ہے اس سے بھی وہ پوری طرح واقف ہیں۔ مگر ان کا خیال ہے کہ ان حالات سے مایوس ہوئے بغیر حوصلہ و عزم کے ساتھ مقابلہ کرنا ہے۔

محرومیوں کا ذکر مسلسل نہ کیجئے
دل کو اداس کیجئے، پاگل نہ کیجئے!

کسی بھی ناگوار بات پر اداسی تو ایک فطری ردِ عمل ہے، اس سے بتقاضائے بشری یکسر کنارہ کشی تو شاید ممکن نہیں مگر بہر حال پاگل پن کی حد تک اداسی کو اوڑھ لینا شاعر کے نزدیک درست نہیں یہی میانہ روی اور شعری رویہ جناب انتظار کو معاصر شعراء سے ممیز کرتا ہے۔ تمام حالات کا حوصلہ مندی سے مقابلہ کرنا اور حوصلوں کو بلند رکھنا یہی ان کا پیغام بھی ہے اور عمل بھی۔

حوصلہ دیکھئے ہر روز قیامت ہے مگر

ہم نے گھر چھوڑا ہے اپنا، نہ وطن چھوڑا ہے

ایک یہ بھی انداز دیکھئے کس طرح خود کو قربان گاہ کی نذر کرنے کے بعد سفاک جابروں کو ان کے ظلم وستم کی داد دیتے نظر آتے ہیں:

آئیں گے سر بکف ابھی کچھ اور اہل شوق
مقتل کو میرے بعد مقفل نہ کیجئے

شعر میں حالانکہ لفظیات، سر بکف، اہل شوق، مقتل، مقفل سب روایتی پس منظر سے تعلق رکھتی ہیں۔ مگر قربانیوں کے تسلسل کو اپنے بعد بھی جاری رکھنے کا یہ اظہار اور حوصلہ ان کی عصری مسائل سے آگہی کا ثبوت بھی ہے۔ دراصل شاعر ان مسائل، مصائب اور حالات کا بڑی حد تک ذمے دار اپنے راہبروں کو سمجھتا ہے۔ ان کی غلط رہنمائی اور لاحاصل ''چارہ گری'' نے اتنے زخم دئے ہیں کہ وہ کہنے پر مجبور ہے:

ذرا سا زخم تھا، پھیلا کے کردیا ناسور
لرز اٹھوں جو کوئی چارہ گر دکھائی دے

غلط رہبری کا جو نتیجہ ہونا تھا وہ قدم قدم پر سامنے آتا رہتا ہے جس کی زد ہمیشہ بے گناہوں پر ہی پڑتی ہے اور ان برخود غلط راہبروں کے بنائے اصول انصاف کا منہ چڑاتے نظر آتے ہیں:

جو خطا کار نہ ہو اس کو سزا دی جائے
وہ عجب ضابطۂ جرم و سزا چھوڑ گیا

مشرق و مغرب کی کشمکش صدیوں سے چلی آرہی ہے۔ مگر آج کے معاشرے پر بالخصوص نئی نسل پر مغربی اثرات کچھ زیادہ ہی حاوی نظر آتے ہیں۔ ایک حساس اسلام پسند شاعر اپنی کھلی آنکھوں سے یہ سب دیکھ رہا ہے اور دل میں بے چینی محسوس کر رہا ہے:

بے لباسی پھر رہی ہے لے کے ہم کو در بہ در
چھین لی مغرب نے مشرق کی ردا برسوں ہوئے

انتظار نعیم اس ملت کے فرد ہیں جسے بلا شبہ ''خیر امت'' ہونے کا شرف حاصل ہے۔ اس حقیقت کے پیش نظر انھیں اپنی ہمیت کا احساس ہے۔ وہ صیغۂ واحد متکلم کے ذریعہ ملت کے ہر فرد کی ترجمانی کرتے ہوئے دنیا کو بھی یہ احساس دلا دینا چاہتے ہیں کہ وہ بھی اچھی طرح سمجھ لے:

میری قیمت سمجھ لے صبحِ فردا
مرا رشتہ ہے اک عہدِ کہن سے
میں نے پتھر پر لکھا ہے خود کو
وقت سے پوچھئے قیمت میری
رائیگاں کرنہ مجھے اے دنیا
آپڑے کل نہ ضرورت میری

قصباتی اور شہری زندگی میں جو فرق ہے وہ ہر زمانے میں محسوس کیا جاتا رہا ہے۔ انتظار صاحب اس تجربے سے گزرے ہیں۔ ان کی ابتدائی زندگی قصباتی ماحول میں گزری، جوانی عروس البلاد کہنے جانے والے شہر بمبئی میں بسر ہوئی اور اب پختگی شعور کا زمانہ راجدھانی دہلی میں گزر رہا ہے۔ اس پس منظر میں نعیم صاحب کا یہ شعر ملاحظہ فرمائیں:

میں لے کے گاؤں سے آیا تھا اک چراغ نظر
اسے بھی شہر کی اندھی گلی نے چھین لیا!

انتظار نعیم کو اہل زمانہ سے ایک یہ بھی شکایت ہے اور بالکل حق بجانب ہے کہ وہ کسی بھی تکلیف یا پریشانی کا تدارک بروقت نہیں کرتے۔ پریشان حالوں سے نظر چرا کر کترا جاتے ہیں۔ البتہ جب یہ دورِ ابتلا گزر جاتا ہے تو مسیحا بن کر منظر پر نمودار ہو جاتے ہیں:

جب خونِ دل ہوا تو زمانہ خموش تھا
اب زخم بھر گئے تو دواؤں کا سلسلہ

غرض انتظار نعیم کی غزل آج کے سلگتے ہوئے مسائل کا آئینہ ہے۔اس میں احتجاج بھی ہے، طنز بھی، کہیں کہیں لہجہ تلخ بھی ہو گیا ہے مگر مایوسی کہیں نہیں۔ وہ ہر مرحلۂ دشوار سے گزرتے ہیں مگر امید کا دامن تھامے رہتے ہیں۔انھیں یقین ہے کہ لمحۂ مسرت اور مژدہ کامیابی ضرور آئے گا:

وہ آئے گا مگر شرطِ وفا ہے
سراپا انتظار یار رہے

جی ہاں ''شرطِ وفا'' کلید ہے ہر فتحمندی اور کامیابی کی۔ اور اس کی اہمیت کے پیش نظر ہی اسے جناب انتظار نعیم نے اپنے مجموعے کا سرنامہ بنایا ہے۔زیر نظر مجموعے میں حصۂ نظم بھی وقیع ہے۔اپنی نظموں میں شاعر نے براہ راست اور دوٹوک رویہ اپنایا ہے۔معریٰ نظموں کے ساتھ آزاد نظمیں بھی خاصی ہیں۔مگر آزاد کا مطلب وزن اور آہنگ سے آزادی نہیں۔ان منظومات میں ترانۂ بیداری، آؤ نئی تاریخ بنائیں، آگ، نفرت کی دیوار گرائیں، اتحاد ملتِ تکبیر مسلسل، التجا، بوجھ، نیا چلن، مجرم اور انتباہ قابل ذکر و مطالعہ ہیں۔دور جہالت (یعنی بعثت سے قبل) لڑکیوں کی پیدائش کو عار سمجھا جاتا تھا اور انھیں پیدا ہونے کے بعد زندہ دفن کر دیا جاتا تھا مگر نبی رحمت ﷺ نے اس لعنت سے دنیا کو چھٹکارا دلایا۔لیکن آج کے ترقی یافتہ دور میں ''دختر کشی'' کا نیا انداز نکلا ہے کہ ان کی پیدائش سے قبل ہی ''رحم مادر'' میں مسیحا کہے جانے والے ''چارہ گروں'' کے ذریعہ انھیں موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے۔نظم ''التجا'' رحم مادر میں پلنے والی ایسی ہی بچی کی ماں سے فریاد ہے کہ مجھے قتل ہونے سے بچالو اور ''مجھے دنیا میں آنے دو'' یہ انتہائی متاثر کن نظم ہے اس سلسلے کی ایک اور نظم ''بوجھ'' بھی تقریباً اسی موضوع پر ہے اور لائق فکر ہے۔ انتظار نعیم کی جن نظموں کا اوپر ذکر آیا ہے جی چاہتا تھا کہ سب کے کچھ اقتباسات پیش کئے جائیں مگر طوالت مانع ہے۔ پھر بھی دو نظموں سے ایک ایک بند یہاں پیش کر رہا ہوں۔''ترانہ بیداری' سے یہ بند دیکھیں:

دل بھی اسی کا جاں بھی اسی کی
ہم اس راہ میں کام آجائیں
اس سے بڑی کیا بات خوشی کی
دین پہ جس نے لٹادی موت بھی اس سے ہاری رہے
ملکوں ملکوں شہروں شہروں ایک نئی بیداری ہے

اور یہ بند نظم ''نفرت کی دیوار گرائیں'' سے حاضر ہے، ملاحظہ فرمائیں:

ساتھ چلیں تو شکوے شکایت ہو بھی سکتے ہیں
پل دو پل کو راہ محبت کھو بھی سکتے ہیں
لیکن لطف ہے رستہ کھو کر پھر پا جائیں ہم

''شرط وفا' اختتامیہ نعتوں پر مبنی ہے۔انتظار نعیم کی سیرتِ طیبہ پر گہری نظر ہے اور اس سلسلے میں مطالعہ بھی وسیع ہے۔جذبۂ عقیدت و محبت بھی کسی نعت گو شاعر سے کم نہیں ہے۔ مگر ان کے نعتیہ کلام میں محض خوش عقیدگی نہیں ہے۔ بلکہ سیرت مطہرہ کے مختلف پہلوؤں کو انھوں نے اپنی نعتوں کے ذریعہ پیش کیا ہے۔صحیح العقیدہ ہونے کے سبب کہیں ''غلو'' یا افراط و تفریط نظر نہیں آتی۔ ہر جگہ ایک سنبھلا ہوا اور نکھرا ہوا انداز ہے۔ دیکھئے واقعہ معراج کو کس سائنٹی فک انداز میں ایک شعر کے اندر پیش کیا ہے:

لمحوں میں کی انھوں نے طے کتنی طویل رہ گزر
صدیوں میں بھی نہ کر سکے یارو یہ کام روشنی

سائنس دانوں نے روشنی کی رفتار کو تیز ترین قرار دیا ہے۔مگر روشنی کی تیز رفتاری بھی حضور ﷺ کے معراج کے لمحے کا صدیوں میں بھی مقابلہ نہ کر سکے گی۔ایک شعر اور دیکھیں جس میں رسول اکرم ﷺ کے امین ہونے کی صداقت کا مذکور ہے۔

اپنے شہر سے ہجرت پر مجبور ہو جب
فکر امانت اس شب بھی کرتا ہے کون

نعت کے اس شعر کی لطافت دیکھیں اور یہ کہ دشمنوں کے ساتھ آپ ﷺ کا رویہ کیسا تھا:

خطائیں بخش دی ہیں دشمنوں کی
مزاجِ مصطفیٰ کیا شبنمی ہے

ایک غلام مصطفیٰ کی در اقدس سے دوری اور نارسائی پر یہ انداز ذرا دیکھیں کیسی حسرت اور آرزو ایک ایک حرف سے ٹپکی پڑ رہی ہے:

تمہارے آستاں کا منہ تکے ہے
نعیم بے نوا کی نارسائی

جناب انتظار نعیم صاحب ایک متحرک اور فعال شخصیت کے حامل ہیں ان کی خدمات کا دائرہ کئی سمتوں میں پھیلا ہوا ہے۔ خدمت لوح وقلم کے ساتھ انفرادی اور اجتماعی طور پر مختلف طریقوں سے ضرورت مندوں کی خدمت اور رہنمائی کے لئے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔

دراصل اللہ کی مخلوق کی خبر گیری خود ایک عبادت کا درجہ رکھتی ہے۔ وہ کئی انجمنوں، اور اداروں کے ذریعہ بھی رفاہی کاموں میں پیش پیش رہتے ہیں۔ شاید یہ ان کی ہمہ جہت مصروفیات ہی ہیں کہ ان کا شعری مجموعہ اب منظر عام پر آیا ہے جبکہ وہ عمر کی ساٹھ منزلوں سے زیادہ طے کر چکے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ ادارۂ ادب اسلامی ہند کے جنرل سکریٹری ''انتظار نعیم'' کی شعری کاوشوں کا یہ پہلا مجموعہ ''شرط وفا'' جو انتہائی اہتمام اور آب وتاب کے ساتھ منظر عام پر آیا ہے۔ عام ادبی حلقوں میں اس کا خیر مقدم کیا جائے گا اور ہر صاحب ذوق کے مطالعے کی میز کی زینت بنے گا۔

☆☆☆

جمال رحمت

نذیر فتح پوری

وجود اس کا کمال رحمت
ہے شخصیت لازوال رحمت
جواب اس کا کہاں سے لائیں
ہے جس کا ہر اک سوال رحمت
معافیاں دشمنوں کو دی ہیں
ہے کون ایسا کمال رحمت
ہے اس سے نسبت خدا سے نسبت
ہے اس سے ملنا وصال رحمت
ہے شان، شانِ کریمی اس کی
ہے اس کا جاہ و جلال رحمت
میں اس کے جلوؤں میں کھو گیا ہوں
ہیں اس کے جلوے جمال رحمت
مثال اس کی نہ ڈھونڈیئے گا
ہے خود میں جو مثال رحمت
نذیر میرے قلم کی کاوش
ہے سب کا سب یہ کمال رحمت

☆☆☆

مرزا حیرت دہلوی کی ''سیرت محمدیہ''

اور اس کی ادبی خصوصیات

مسعود احمد الاعظمی

سیرت محمدیہ - علی صاحبہا الف الف صلاۃ وتحیۃ۔ کسی زبان کا اہم اور مقدس ترین علمی وقلمی سرمایہ ہوتا ہے، ہر وہ مصنف یا صاحب قلم جس کا قلب ایمان کی حرارت سے گرم اور اس کے نور سے منور ہوتا ہے، وہ پیغمبر اسلام علیہ الصلاۃ والسلام کی سیرت پاک اور حیات بابرکات پر قلم اٹھانا اپنے لئے باعث سعادت خیال کرتا ہے، مگر سیرت نبوی پر لکھنے کے لئے جس ذمہ داری اور احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے، جب دل ودماغ میں اس کا خیال آتا ہے، تو اشہب قلم اپنی روانی وجولانی بھول جاتا ہے، دل میں کپکپی طاری، ہوجاتی ہے اور ذہن ودماغ یہ سوچنے اور خیال کرنے پر مجبور ہوتا ہے کہ:

ہزار بار بشویم دہن بمشک و گلاب
ہنوز نام تو گفتن کمال بے ادبی ست

میں سمجھتا ہوں کہ دنیا میں کوئی زبان ایسی نہیں ہوگی، جو مسلمانوں میں استعمال ہوتی ہو، بولی اور لکھی اور برتی جاتی ہو اور اس میں سیرت نبوی کا بڑا حصہ موجود نہ ہو اور اس زبان والوں کی حرارت قلبی اور نور ایمانی کی افزونی کا باعث نہ بنتا ہو۔

اردو زبان میں بھی سیرت پاک کا ایک اچھا ذخیرہ اور قابل قدر سرمایہ وجود میں آچکا ہے، اگرچہ اس میں مزید اضافے کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جاسکتا، لیکن یہ کہنے میں بھی تامل نہیں کہ اس زبان میں سیرت نبوی کا جو حصہ موجود ہے، وہ سیرت کی اصل ضرورت یعنی آنحضرت ﷺ کی حیات طیبہ کا مطالعہ کرکے آپ کی زندگی، آپ کی پاکیزہ تعلیمات اور آپ کے اخلاق حسنہ کو اسوہ اور نمونہ بنانا، تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس کے لئے سیرت کا موجودہ سرمایہ کافی ہے، اور اردو میں بھی تامل نہیں کہ اس زبان میں سیرت نبوی کا جو حصہ موجود ہے، وہ سیرت کی اصل ضرورت یعنی آنحضرت ﷺ کی حیات طیبہ کا مطالعہ کرکے آپ ﷺ کی زندگی، آپ ﷺ کی پاکیزہ تعلیمات اور آپؐ کے اخلاق حسنہ کو اسوہ اور نمونہ بنانا، تو اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ اس کے لئے سیرت کا موجودہ سرمایہ کافی ہے، اور اردو زبان وادب میں حیات مقدسہ پر جو کچھ لکھا جاچکا ہے، وہ اس زبان والوں کے لئے یقیناً مشعل راہ اور سرمایۂ سعادت بن سکتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ سیرت پاک کا عنوان جس قدر مقدس، پاکیزہ، پُرکشش اور روح پرور ہے اور آپؐ کے اخلاق وعادات واوصاف کو جس قدر رفعت وبلندی حاصل ہے، اس کا احاطہ تو درکنار اس کا ادراک بھی ممکن نہیں ہے، اور یہ بات بلاخوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ جو زبان جب تک زندہ رہے گی، سیرت نبوی پر توجہ اور تصنیف وتالیف کی ضرورت بھی باقی رہے گی، اور ہر نقش تحریر کے بعد یہی کہا جائے گا کہ۔

لایمکن الثناء کما کان حقہ
بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

اردو زبان میں سیرت کی ابتدائی تالیفات میں مرزا حیرت دہلوی کی کتاب ''سیرت محمدیہ'' کا شمار کیا جاسکتا ہے، اس کتاب کے مطالعہ کے نتیجے میں اس پر اپنے معروضات پیش کرنے

سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کے تعارف میں چند سطریں سپرد قلم کردی جائیں۔

مجھے بہت افسوس ہے اور اپنی بے بضاعتی کا احساس کہ سخت تلاش اور متعدد کتب تذکرہ وتراجم کی ورق گردانی کے باوجود مصنف کا سیر حاصل تذکرہ تو درکنار زندگی کی ضروری معلومات تک دستیاب نہ ہوسکیں، حالانکہ ان کی علمی و تصنیفی خدمات کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کی شخصیت ایسی نہیں تھی کہ ان کے معاصرین یا اس دور کے اہل علم وقلم پر جو کتابیں تصنیف کی گئی ہیں، ان میں مرزا حیرت کے تذکرے کو نظر انداز کیا جاتا:

اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ مرزا حیرت دہلوی اپنے ہم عصروں میں اچھی شہرت کے حامل نہیں تھے، مجھے ان کا جو تشنہ اور نامکمل تذکرہ ملا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے زمانے کے اہل علم ان سے خوش نہیں تھے، اور اپنے معاصرین میں وہ اچھی شبیہ نہیں رکھتے تھے، شاہد احمد دہلوی نے ان کی زندگی کا خاکہ یوں کھینچا ہے:

"بہت بڑے عالم تھے، مگر ان کا دماغ صرف برائی سوچتا تھا، دلی میں چھاپے کی مشین سب سے پہلے انھوں نے ہی لگائی تھی اور کرزن گزٹ جاری کیا تھا، اس اخبار میں جس کی چاہتے خبر لیتے، جس کی چاہتے ٹوپی اتار لیتے، شورش پسند آدمی تھے، طرح طرح کے ہنگامے برپا کرتے رہتے تھے"

بزم خوش نفسان: ۲۱۶

ان چند سطروں سے یہ نتیجہ نکالنا مشکل نہیں کہ ان کو علم و فن کے ساتھ شغف اور لگاؤ اور اس کی نشر واشاعت سے دلچسپی تھی، خواہ ان کی زندگی کتنی ہی ہنگامہ خیز کیوں نہ ہو، انھوں نے سیرت محمدیہ کے مقدمے میں اپنی تصانیف کی جو فہرست ذکر کی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ انیسویں صدی کے ایسے کثیر التصانیف عالم تھے، جن کا قلم مستقل رواں دواں رہتا تھا، اس فہرست سے اور اس کے علاوہ ان کی بعض دوسری کتابوں کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مشاہیر کی سوانح عمری ان کی دلچسپی کا خاص موضوع تھا، مقدمۂ سیرت میں انھوں نے اپنی انتیس (۲۹) کتابوں کی فہرست دی ہے، ان میں ۲۱ کتابیں سوانح عمریوں پر مشتمل ہیں، اس فہرست میں خلفاء راشدین کے تذکروں کے علاوہ "حیات اعظم" کے نام سے چار حصوں میں ائمہ اربعہ کی سوانح عمری، سعدی وفردوسی کی سوانح عمری، اور "حیات طیبہ" کے نام سے حضرت مولانا شاہ اسماعیل شہید علیہ الرحمہ کی سوانح عمری شامل ہے، مذکورہ بالا شخصیات کے علاوہ متعدد عرب اور یونانی فلاسفہ اور بعض شاہان مغلیہ کے مستقل تذکرے بھی ہیں، مرزا حیرت نے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی الانصاف کا اردو ترجمہ بھی کیا ہے۔ نیز انگریزی زبان کے دو ناولوں کو اردو کا جامہ پہنایا ہے۔

"سیرت محمدیہ" ۱۸۹۵ء میں طبع ہوئی ہے اور اس میں ۱۸۹۴ء تک شائع ہونے والی اپنی کتابوں کا انھوں نے ذکر کیا ہے، اس میں جو کتابیں مذکور ہیں، ان کے علاوہ تین اور کتابیں بھی اس عاجز کی نظر سے گزری ہیں، ایک "حیات حمیدیہ" جو سلطان عبدالحمید خاں غازی کی سوانح عمری ہے اور کرزن پریس سے ۱۳۱۷ھ میں شائع ہوئی ہے۔ دوسری ان کی ترجمہ کی ہوئی امیر عبد الرحمٰن خاں غازی کی سوانح عمری "تزک امیری" ہے جو ۱۳۱۸ھ میں شائع ہوئی ہے۔ اور تیسری "چراغ دہلی" ہے، جس میں اردو کی تاریخ اور دہلی کے حالات وواقعات مذکور ہیں، یہ کتاب ۱۹۰۳ء میں شائع ہوئی ہے۔ ان کے علمی، ادبی اور قلمی مقام کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ وہ "اودھ اخبار" کے ایڈیٹر بھی رہ چکے تھے۔

حیرت صاحب کی فہرست تالیفات نیز "سیرت محمدیہ" کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو انگریزی زبان پر بھی دسترس حاصل تھی اور اس زبان کی تصنیفات کا اچھا خاصا ذخیرہ ان کی نگاہ کے سامنے تھا۔ انگریزی مصنفین اپنی کتابوں میں اسلام، پیغمبر اسلام اور عظماء ومشاہیر اسلام کی تصویر جس طرح مسخ کرکے اور بگاڑ کر پیش کرتے تھے، اسلامی تعلیمات اور آنحضرت ﷺ کی

سنت وسیرت کو جس طرح ہدف، طعن وتشنیع بناتے تھے، اس کے مقابلہ اور مدافعت کے لئے وہ سینہ سپر ہوجانا چاہتے تھے، مسلمانوں کی فرقہ بندی اوران کے مسلکی وگروہی اختلافات سے وہ بیزار، بددل اور نالاں نظر آتے ہیں، اور چاہتے ہیں کہ اہل اسلام کی قوت مجتمع ہوکر اسلام دشمنوں کی سازشوں اور سرگرمیوں کے ردوابطال میں مرکوز ہوجائے۔

"سیرت محمدیہ" کا اجمالی جائزہ:

۱۔ اس کتاب کے مطالعہ بلکہ اس کے مقدمے ہی سے پہلا تاثر جو ابھرتا ہے، وہ یہ ہے کہ مصنف نے اس کی تالیف یوروپین مصنفین کی تالیفات سیرت کو سامنے رکھ کر کیا ہے، اور اس کتاب کی تصنیف سے ان کا اہم مقصد ان اعتراضات کا جواب دینا ہے جو مغربی مصنفین حضرت رسالت مآب ﷺ کی ذات اقدس واطہر پر کیا کرتے ہیں۔

۲۔ الزامی جواب کے طور پر جگہ جگہ پیغمبر آخرالزماں ﷺ اور حضرت مسیح علیہ الصلاۃ والسلام کی حیات وتعلیمات کا موازنہ کیا ہے، اور ظاہر ہے کہ اس طریقۂ کار کا مقصد حضرت مسیح علی نبینا وعلیہ الصلاۃ والسلام کی زندگی پر طعن یا ان کی تنقیص نہیں، بلکہ محمد رسول اللہ ﷺ کی نبوت ورسالت کی حقانیت وصداقت کو ثابت کرنا ہے۔

۳۔ مصنف نے بہتیرے مقامات پر محمد رسول اللہ ﷺ کے صحابۂ کرامؓ اور جاں نثار جماعت اور حضرت عیسی علیہ السلام کے عقیدت مندوں اور ماننے والوں کی زندگیوں اور اپنے اپنے پیغمبروں کے ساتھ عقیدت ومحبت کا تاریخی واقعات کی روشنی میں مقابلہ کیا ہے، اور خود یوروپین مصنفین کی عبارتوں کو پیش کرکے دکھایا ہے کہ حضرت عیسی علیہ السلام کے عقیدت مند کس طرح مصیبت کے وقت میں اور سولی دیے جانے کے موقع پر دور سے کھڑے ہوکر تماشہ دیکھتے رہے، اور اس کے برعکس محمد رسول ﷺ کے صحابہ اور انصار ومہاجرین کی تاریخ ان کی جاں نثاری اور فداکاری کے واقعات سے بھری پڑی ہے۔

۴۔ مصنف نے کتب سیرت کے عام نہج کے خلاف تاریخی واقعات کو ترتیب وار ذکر کرنے پر زیادہ زور نہیں دیا ہے، بلکہ آنحضرت ﷺ کی حیات کے ہر دور میں یا ہر سال پیش آنے والے واقعات کا مجموعی تذکرہ کرتے ہوئے آپ کے سیرت وکردار اور اس دور کی خصوصیات کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔

کتاب کی زبان اور اس کا اسلوب:

"سیرت محمدیہ" کو حیات مقدسہ کے مضامین کے اعتبار سے اس فن کی معیاری کتابوں کے زمرے میں نہیں رکھا جاسکتا، اس لئے کہ مصنف نے رسول پاک ﷺ کے حالات وواقعات کو مرتب طور پر بیان کرنے سے زیادہ مضمون آفرینی پر توجہ صرف کی ہے، اور کہیں کہیں مغربی ومسیحی مصنفین کے اعتراضات کے ردو ابطال میں اس قدر دراز نفسی سے کام لیا ہے کہ سیرت کا مضمون گم ہوکر رہ گیا ہے۔

جہاں تک زبان وبیان اور تعبیرات کا تعلق ہے، اس لحاظ سے البتہ اس کو ایک نمایاں اور ممتاز تصنیف قرار دیا جاسکتا ہے، اس کی زبان سہل اور سادہ ہے، الفاظ شستہ اور شگفتہ ہیں، عبارت رواں اور سلیس ہے، جملوں کی ساخت اور ترکیب مربوط ومستحکم ہے، انداز بیان شوکت وقوت سے بھرپور ہے، تشبیہات واستعارات اور محاورات کا استعمال جابجا اور بہ کثرت ہے، علم بیان وبدیع کی دوسری اقسام بھی بہت پائی جاتی ہیں، اس لحاظ سے بے جھجک یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس کتاب میں دہلی کی ٹکسالی زبان پوری طرح جلوہ گر ہے، اور یہ کتاب مصنف کے ادبی مقام کی آئینہ دار ہے۔ ذیل میں مصنف کی عبارت اور فصاحت وبلاغت کے کچھ نمونے نقل کیے جارہے ہیں:

مقدمہ اولی میں صفحہ ۵ پر علم کی اہمیت اور علماء کے مقام کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"یہ ضروری نہیں کہ ایسے پاک اور مبارک انفاس کسی خاص زمانہ، خاص قوم، خاص حالت، خاص وقت اور خاص موسم

میں پیدا ہوں، نہیں! ہر دشت وصحراء میں یہ خوشبودار پھول کھلتے ہیں، اور بادِ نسیم کو معطر کر کے اوروں کے دماغوں کو بساتے ہیں، ہر بے پایاں اور گہرے سمندر میں کسی نہ کسی سیپی میں ضرور شاہانہ تاجوں کو زیب دینے والے گوہر موجود ہیں، مگر ان سے وہ ہی لوگ مستفیض ہو سکتے ہیں، جو اپنا خون پسینہ ایک کر دیں اور ان کی تلاش میں جان لڑا دیں۔"

مذکورہ بالا عبارت میں "خون پسینہ ایک کر دیں" اور "جان لڑا دیں" اگر محاورہ ہے، تو باقی عبارت استعارہ ہی اس استعارہ ہے، انھوں نے اس صنعت کا استعمال بہت کیا ہے، اس سے زبان پر ان کی قدرت اور گرفت کے ساتھ ساتھ اندازہ ہوتا ہے کہ الفاظ کے برمحل استعمال پر ان کو کس قدر مہارت حاصل تھی، صفحہ ۲۶ پر ہندو مذہب پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"باجود یکہ اس میں (بودھ مذہب میں) صریح نقص تھا، پھر بھی اس نے اپنی قسمت کی مہر ہندوستان کے دل پر مذہبی پہلو میں ہو کر ثبت کر دی۔ مگر جب بودھ مذہب کا زمانہ عمر پورا ہو گا، تو اس کا ہندوستان سے اخراج ہوا اور اس کی جگہ برہمنوں کے مذہب نے قیام پکڑا۔ منادر اوباشی اور طرح طرح کے گناہوں کے نشیمن یا مسکن بنے۔"

چند سطروں کے بعد آگے لکھتے ہیں:

"اس سے صاف کھلتا ہے کہ عورتیں برہمنوں کی حکومت میں کس درجہ پامال کی جاتی تھیں، اور ان کی عصمت کا جھم جھماتا ہوا تاج کس درشتی اور وحشی پن سے اتار لیا جاتا تھا"

زرتشتی مذہب پر گفتگو کرتے ہوئے صفحہ ۳۴ پر لکھا ہے:

"زرتشتی مذہب کی آگ سرد تھی، گو بڑے بڑے منادر پرستش گاہوں میں شب و روز خوفناکی سے جلتی تھی، لیکن قوم زرتشتی کے دلوں میں یہ آگ بالکل سرد تھی، اس کے ہولناک بھڑکتے ہوئے شعلے آتش کدوں ہی تک محدود تھے، ان کا اثر دلوں کی مجمر میں مطلق نہ تھا"

کتاب میں محاورات کا استعمال بھی بہت کیا گیا ہے، اور نہایت خوبی وخوش اسلوبی سے کیا گیا ہے، مثال کے طور پر مسیحی یورپ کے تاریک دور کے سلسلے میں لکھا ہے:

"ساتھ ہی اس کے رہبانیت کا ایسا زور پیدا ہوا کہ رہا سہا علم بھی گریبان پھاڑ کر بھاگا" (ص:۴۷)

برجستہ اور برمحل محاوروں کی مثالوں میں صفحہ ۵۷ پر یورپ کے اسی دور پر مصنف کی یہ عبارت ہے:

"بایں ہمہ غلاموں کی حالت مصیبت ناک اور ناگفتہ بہ تھی، آبادی میں غلاموں ہی کا بڑا جزو تھا کہ جس پر طرح طرح کی سختیاں اور آفتیں توڑی جاتی تھیں، اور ان کی زندگی اس تکلیف میں گزرتی تھی کہ ان کے افسوسناک حالات سن کر ہم آٹھ آٹھ آنسو روتے ہیں"

سوانح کے پہلے باب میں آنحضرت ﷺ کے ساتھ قریش کی دشمنی اور ان کی ایذا رسانیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"پھر بھی ابتدائی زمانہ محمدؐ کے لئے بہت سخت تھا، مخالفت بھی وہ مخالفت کی جاتی تھی کہ جس کے سننے سے پتہ پانی ہو جاتا ہے اور زہرہ آب ہوتا ہے" (ص:۱۷۳)

حیرت صاحب نے آنحضرت ﷺ کے اخلاق فاضلہ اور اوصاف حمیدہ کو کہیں کہیں نہایت دل نشیں اسلوب اور خوبصورت پیرائے میں بیان کیا ہے، کہ فصاحت و بلاغت بھی بلائیں لیتی ہوئی دکھائی دیتی ہے، چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:

"ان ریتیلے تپتے ہوئے وسیع ریگستانوں میں چمکتے ہوئے آفتاب کی تپش مارتی ہوئی دھوپ کے نیچے پیاسا رہتا، مگر دوسروں کو خشک لب نہ دیکھ سکتا، گو اس کے حال زار پر کوئی آنسو بہانے والا نہ ملتا، مگر دوسروں کی مصیبت ناک حالت پر آنسو گرانے کو موجود رہتا، اپنی حد سے زیادہ بے سروسامانی کی حالت میں بھی وہ کسی غریب مفلس کی مدد کرنے ہی کا خواہش مند رہتا، مصیبت میں اسے کسی کی مشکل کشائی کی دھن لگی رہتی۔"

صفحہ ۱۶۷-۱۶۸ پر لکھتے ہیں:

''اس کا خلق اپنے ہی گروہ تک محدود نہ تھا، بلکہ دشمنوں پر اسی طرح وسیع تھا، دنیا میں جس نے اپنے دشمنوں کی نجات کی دعا کی اور ان کی دل سے بھلائی چاہی وہ وہ پاک ذات تھی جس کو محمدؐ عربی کہتے ہیں۔ دنیا میں جس نے امیر و غریب کو ایک کر دیا اور کچھ امتیاز نہ رکھا، وہ وہی قریشی نبی تھا جس کا مقدس نام آج تیس کروڑ باشندے لے رہے ہیں، صدیوں کے جھگڑوں اور خوں ریزیوں کو جس نے مٹا دیا اور ان کے الجھاؤ کو چٹکیوں میں سلجھا دیا وہ محمد تھا''

صفحہ ۱۷۲ پر لکھا ہے:

''قریش قوم کا بچہ بچہ یہ خوب جانتا تھا کہ محمدؐ سے بہتر نیک خصال اور شریف طبیعت بچہ پیدا نہیں ہوا، آپ کی صادق الوعدی کی دھوم تمام مکہ میں مچ رہی تھی، اور مکہ کی چار دیواری اور سنگلاخ چٹانوں کے پرے اگر کوئی محمد کو جانتا تھا، تو اس قدر جانتا تھا کہ اس کی بے لوث اور پاکیزہ زندگی ہے، وہ خود بھی نیک ہے اور دوسرے کو بھی نیک بنانا چاہتا ہے، اس کی غرض ہے کہ میں دنیا میں ریفارم کروں''

قریش کی مخالفت اور دائرہ اسلام میں داخل ہونے والے اولین مسلمانوں کا تذکرہ کرتے ہوئے نہایت مؤثر اور بلیغ اسلوب میں لکھتے ہیں:

''ایسی حالت میں کہ چاروں طرف سے مخالفانہ آوازیں کانوں میں گونجتی ہوں، ہر شخص کی آنکھوں میں دشمنی اور سخت عداوت کا خون موج زن ہوتا ہو، اور حسد کے شعلے بھڑکتے ہوں، اور ہر متنفس خون کا پیاسا ہو، کوئی دوست تو دوست معمولی ہاں میں ہاں ملانے والا بھی نہ ہو، ہر شخص کی زیادتی اور ستانے کی حد ہو چکی ہو، جسمانی ایذا رسانی کے لئے انجمنیں ہوتی ہوں، قریش کے بڑے بڑے سردار قسم اس بات پر کھاتے ہوں کہ ہم محمد کو جہاں پاویں گے قتل کر ڈالیں گے، اور ہرگز نہیں چھوڑنے کے، باہمی معاہدے ہوتے ہوں اور شرطیں لگائی جاتی ہوں، عبادت کی جگہ تیز کانٹے بچھائے جاتے ہوں اور آپ پر ناپاکی پھینکی جاتی ہو، ایسی حالت میں اپنے عظیم الشان ارادہ پر مستقل رہنا، نہ اپنی تنہائی کی پروا کرنا اور نہ دشمنوں کی مخالفت پر توجہ کرنا، یہ کس کا کام ہے؟ کیا کوئی معمولی انسان ایسا کر سکتا ہے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ اولوالعزم بہادر یہ آفتیں سہے، اور پھر بھی دشمنوں کی اصلاح ہی کا خیال رکھے، اور ان کی بھلائی ہی چاہے؟ ہمیں اگر کسی سے کچھ بھی ایذا پہنچتی ہے تو لاکھ ہم رحم دل اور نرم قلب ہی کیوں نہ ہوں، پھر بھی یہ محض ناممکن ہے کہ ہم اس کا برا نہ چاہیں، مگر ایسی نظیر دنیا میں کسی کی نہیں پاتے کہ جو اپنے جانی دشمنوں کا بھی اسی طرح خیر خواہ ہو جیسے اپنے دوستوں کا، ایسی نازک حالت میں دلیرانہ اپنے معتقدوں کو پناہ کی جگہ روانہ کر دینا آپ اپنی جگہ پر اسی استقلال، اسی ارادہ، اسی عزم سے جمے رہنا، اسی پاک نفس کا کام ہے کہ جو ہم ہی میں سے تھا، مگر ہم میں اور اس میں نبوت نے بین امتیاز کر دیا تھا'' (ص ۲۰۴-۲۰۶)

حیرت صاحب نے یوروپین مصنفین کے جو اقوال نقل کیئے ہیں، بلکہ ان کی جن عبارتوں کا اردو میں ترجمہ کیا ہے، ان کو بھی اس قدر سلاست کے ساتھ اور اتنے مؤثر و بلیغ پیرائے میں ڈھال کر پیش کیا ہے کہ ترجمہ کا گمان نہیں ہوتا ہے، مثلاً صفحہ ۲۰۸ پر ایک یوروپین مصنف کے قول کو اس طرح ذکر کرتے ہیں:

''پروفیسر میموری لکھتا ہے کہ ابتدا سے انتہا تک غیر متغیر سلامتی عقل، سنجیدگی اور استقلال، مختلف نازک حالتوں میں یکساں رہنا ایک طرفہ تربات ہے، جس شخص کی اول سے آخر تک ایک آواز، ایک لہجہ، ایک مفہوم رہا ہو، اور جو خدا کی وہی عظمت چاہتا ہو جس لئے کہ وہ پیدا کیا گیا تھا، بیشک امتیاز یہ حالت کا فوٹو اتارتا ہے، اور سب سے زیادہ یہ اور بھی عجیب تربات ہے کہ انتہا درجہ کی سربلندی حاصل ہونے پر بھی وہ ہی عاجزی، وہ ہی انکساری، وہ ہی حلیمی، وہ

ہی مسکینی وہ ہی شیرینی، وہ ہی غلق بجا رہا ہو، جو محض بے سرو سامانی کی حالت میں تھا۔"

حیرت صاحب کی تحریر کا ایک خاصہ یہ ہے کہ وہ بالعموم شوکت وقوت سے معمور ہوتی ہے، انداز بیان ٹھوس، مستحکم اور بلند آہنگ ہوتا ہے، صفحہ ۱۹ پر اسلام کا دوسرے مذاہب سے موازنہ کرتے ہوئے لکھتے:

"آزادی جو انسانیت کا اصلی تمغہ ہے، اور مہذب دنیا میں حاصل کرنے کے لئے ہزار ہا جانیں ضائع ہو چکی ہیں، اور صدہا گھر بے چراغ ہو گئے، مگر ہمارے نبی ﷺ نے بغیر ایک خون کی بوند گرائے مہذبوں کو درکنار، وحشیوں کو تمغۂ تہذیب سے آراستہ کر کے بادشاہ اور فقیر، عالم اور جاہل کو برابر کر دیا، اور اس سچے مصلح کی طبیعت میں آزادی نے اس قدر جوش مارا کہ اس نے برملا یہ فرمادیا کہ میں بھی تمہاری طرح ایک آدمی ہوں۔ اس قول نے ایک سچی حرارت غیر مومنین کے دلوں میں پیدا کی اور پھر وہ اسلام کی برکتیں سمیٹنے کے لئے ٹوٹ پڑے۔"

غزوۂ موتہ کے موقع پر جب اہل اسلام کو عیسائی حملوں سے سخت خطرہ درپیش تھا، اور دشمن اہل اسلام کے خلاف پوری قوت بروئے کار لا چکے تھے، اس کا نقشہ کھینچتے ہوئے صفحہ ۳۴۵ پر لکھا ہے:

"بہادر زید پر شوق مگر کسی قدر خائف نظروں سے اس ٹھاٹ کو دیکھ رہا تھا، اس کی تلوار میان سے اس طرح نکلی پڑتی تھی جیسے اس کا تیز گھوڑے اس کی رانوں سے نکلا جاتا تھا، وہ شوق جنگ سے بے چین تھا اور اپنی باری آنے کا راستہ دیکھ رہا تھا، اس کا جی چاہتا تھا کہ اپنے گھڑے کے سُم دشمنوں کے خون سے تر کروں اور عیسائیوں کے مقابلہ میں اسلام کی بہادری دکھادوں۔"

"مسیحی بھی دلیر تھے، تین سرداروں کے متواتر شہید ہونے نے انھیں اور بھی چیرہ دست بنا دیا تھا، وہ جانتے تھے کہ اس جنگ کا نتیجہ ہمارے حق میں اچھا ہوگا، مگر ابھی خالد کی خون آلود تلوار کی بانگی دیکھنی انھیں باقی تھی، جوں ہی انھوں نے خالد کو بڑھتے ہوئے دیکھا پُرخوف پرندوں کی طرح وہ ایک جگہ سمٹ گئے اور ان کے سردار نے پھر انھیں یہ کہہ کر آگے بڑھایا میدان ہمارے ہاتھ لگ چکا ہے صرف یہ ایک کانٹا باقی ہے اس کو بھی نکال کر پھینک دو۔"

بنونضیر کی سرکشی، ان کی بدعہدی اور ان کے واقعہ جلاوطنی کے تذکرے میں ان یہودیوں کی بدطینتی وبدباطنی اور رحمۃ للعالمین ﷺ کے رحم وکرم کی نسبت رقم طراز ہیں:

"انھیں اپنے چمکتے ہوئے ہتھیاروں پر غُرّا تھا، وہ اپنی کثیر التعدادی پر پھولے ہوئے تھے، اپنے موٹے تازے جسموں اور جفاکشی کی عادت پر انھیں بہت بڑا گھمنڈ تھا، انھیں اپنے قانون جنگ پر زیادہ بھروسہ تھا، برخلاف اس کے محمدیوں کے پاس کچھ نہ تھا، اگر تھا تو صرف وہ بھروسہ تھا کہ جو خدا پر رکھتے تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان ہوشیار ہوئے اور پہلے ان کی طرف متوجہ ہوئے، ان کو چاروں طرف سے گھیر لیا، پندرہ دن کے بعد وہ قابو میں آئے، پہلے یہ ارادہ تھا کہ انھیں ان کے جرائم کی پوری سزا دی جاتی، ان کو سخت بے رحمی سے قتل کیا جاتا، لیکن محمد کی رحیم فطرت نے یہ گوارا نہیں کیا کہ ایک بوند بھی خون کی گرائی جائے، ہاں صرف یہ کیا کہ انھیں جلاوطن کر دیا گیا۔" (ص:۳۰۸)

زبان وبیان، اسلوب اور صنائع وبدائع کے اعتبار سے بلاشبہ مرزا حیرت دہلوی کی "سیرت محمدیہ" اردو زبان کے ذخائر سیرت میں ایک اہم کتاب شمار کی جاسکتی ہے، اگرچہ انھوں نے بعض مقامات پر ایسی تعبیر اور پیرایۂ بیان اختیار کیا ہے، جو غیر موزوں اور نامناسب ہے، مثلاً انھوں نے کہیں "نبوت کا ڈپلومہ" کی تعبیر اختیار کی ہے، جو دل میں بری طرح کھٹکتی ہے اور شان نبوت کے منافی معلوم ہوتی ہے۔ اور مثال کے طور پر صفحہ ۲۱۲ لکھا ہے:

"جتنے نبی پہلے گزر گئے، اگر ہم مودبانہ مگر آزادانہ طریقہ سے ان کی لائف پر نظر ڈالیں گے تو ہمیں معلوم ہوگا کہ لوگوں کی مخالفت نے انھیں ان کے ارادوں میں کیسا کچا کردیا اور وہ کیسے مایوس ہوکر زار زار روئے ہیں، اور ان کے کلام میں کیسی مختلف اقوال پائی جاتی ہے، جس سے صحائف انبیائے لبالب بھرے ہوئے ہیں۔"

یہ طرز تعبیر انتہائی غیر مناسب اور انبیاء کرام کی شان کے خلاف ہے، جس سے بچنے کی سخت ضرورت ہوتی ہے، محمد رسول اللہ ﷺ کی سیرت وسوانح کے بیان میں ایسا انداز ہرگز نہیں آنا چاہئے جس سے دوسرے پیغمبروں کی تنقیص کی بو آتی ہو۔

واقعات کو بیان کرنے میں بھی مصنف سے کہیں کہیں تسامح ہوا ہے، اور ایسی باتیں قلم بند کردی ہیں، جو صحیح روایات اور تحقیقی بات کے خلاف ہیں، مثلاً جب غار حراء میں آپؐ پر پہلی مرتبہ وحی نازل ہوئی، اور آپ حضرت خدیجہؓ کے پاس گئے، تو اس کی نسبت ۱۵۶ پر لکھا ہے:

"اس پر بی بی خدیجہؓ نے فرمایا مبارک ہو اے پیارے خاوند مبارک ہو! خوشی اور بہت خوشی کا مقام ہے تو پیغمبر بنایا گیا، گویا آج کی رات سے تجھے نبوت بخشی گئی۔"

حالانکہ صحیح روایات سے صرف اتنا ثابت ہوتا ہے کہ حضرت خدیجہؓ نے آپ ﷺ کے اوصاف حمیدہ کا تذکرہ کرکے آپ کو تسکین دی، حضرت خدیجہؓ کا نبوت کی بات نہیں کی تھی۔

آگے صفحہ ۱۵۹ پر ورقہ بن نوفل کے پاس آنحضرت ﷺ کے جانے کے بارے میں لکھتے ہیں:

"اس نے جب سب نشانیاں سنیں تو اس قدر جوش پیدا ہوا کہ مکہ کی شاہراہوں میں اس ضعیفی کی حالت میں لکڑی ٹیکتا ہوا پھرنے لگا اور جہاں اس نے دو آدمیوں کو بھی باہم باتیں کرتے سنا تو با آواز بلند کہا کہ مخلوق کا نجات دہندہ پیدا ہوگیا۔"

ورقہ بن نوفل کا آنحضرت ﷺ کو اس موقع پر نبوت کی بشارت دینا یا زیادہ سے زیادہ آپ ﷺ کی نبوت کی تصدیق کرنا ثابت ہوتا ہے، مصنف کی مذکورہ بالا عبارت ان کی قوت تخیل کی پیداوار معلوم ہوتی ہے۔

آپ ﷺ کی ولادت دس نومبر ۵۷۰ء لکھنے کے بعد پھر لکھتے ہیں کہ دسویں نومبر ۵۷۰ء مشکوک ہے، بلکہ زیادہ صحت کے ساتھ ۲۹ راگست ۵۷۰ء آپ کی تاریخ ولادت ہے جبکہ کتب سیرت میں عام طور پر ۲۰ راپریل ۵۷۱ء بتائی جاتی ہے۔

اگر ایک طرف مصنف نے وحی اور جبرئیل وملائکہ مسئلے پر اپنے قلم کی خوب خوب جولانی دکھائی ہے، اور مغربی مصنفین اور سرسید احمد خاں کے ردوابطال میں پورا زور قلم صرف کیا ہے، تو افسوس ہے کہ دوسری طرف خود اسی بے اعتدالی کا شکار ہوگئے ہیں، اور غزوۂ بدر کے سلسلے میں "امنۃً نعاساً" میں یہاں تک لکھ گئے ہیں کہ "اس آیت اور ایک پہلی آیت میں جو نعاس کا لفظ ہے اس پر لوگوں نے روایتیں گھڑنی شروع کیں"

اس میں حیرت صاحب نے جن روایتوں کی طرف اشارہ کیا ہے ان میں صحیح بخاری کی ایک روایت بھی ہے جو حضرت ابوطلحہؓ سے مروی ہے اور خود مصنف نے بھی اس کو ذکر کیا ہے، اگرچہ بخاری شریف کا حوالہ نہیں دیا ہے۔ حیرت صاحب نے آگے لکھا ہے:

"اکثر مفسروں کے یہ بے سروپا خیالات مخالفین کو مضحکہ اڑانے کا اچھا موقع دیتے ہیں" (ص:۲۷۰)

اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حیرت صاحب بھی مخالفین اسلام کے حملوں سے اسی مرعوبیت کا شکار ہوگئے ہیں، جس کا طعنہ انھوں نے دوسروں کو دیا ہے۔

☆☆☆

☆☆☆

عربی میں ادبی تنقید کا ارتقا

فیصل احمد بھٹکلی ندوی

تنقید کا تعلق دراصل ذوق سے ہے، جو بھی کلام کے حسن وقبح سے واقف ہو اور اچھے اور برے میں فرق کی صلاحیت رکھتا ہو وہ تنقید کا حق رکھتا ہے، چوں کہ عرب جاہلیت میں زبان کا بہت اعلیٰ ذوق رکھتے تھے اس لیے لازماً تنقید میں بھی کمال رکھتے تھے اور اس کا جاہلی معاشرہ میں رواج بھی تھا، اس کی مثالیں ادب کی تاریخ میں ملتی ہیں، مگر چوں کہ وہاں سارا معاملہ زبانی روایات پر تھا اور نقد میں غور وفکر کی ضرورت پڑتی ہے اور زبانی روایات میں اس کا پورا موقع نہیں ہوتا اس لیے تنقید کو کوئی فنی حیثیت حاصل نہ ہوسکی، مگر جب تصنیف وتالیف کے دور کا آغاز ہوا تو تنقید بھی دبے پاؤں آگے بڑھتی گئی۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ تنقید کا وجود فن کے وجود کے ساتھ ہوتا ہے، جب تک فن کار نے خود اپنی تنقیدی بصیرت سے کام نہ لیا ہو فن کا وجود نہیں ہوسکتا، اس لحاظ سے سوچیں تو یہ بات لازم آتی ہے کہ عربی زبان کے پہلے شعر کے وجود کے ساتھ ناقد اول کا وجود ہوا ہوگا، مگر علوم وفنون کی ترقی اور تمدن کے عدم ارتقا کے باعث جاہلیت میں عربوں کا تنقیدی رجحان صرف ان کے فطری ذوق پر مبنی تھا، اس میں کسی فکری تحلیل وتجزیہ کو دخل نہیں تھا، اس کا خاص پہلو یہ تھا کہ الفاظ کا استعمال اپنے معنوی سیاق وسباق کے لحاظ سے درست ہے یا نہیں، اور شاعر زبان پر قادر ہے یا نہیں، تنقیدی نقطۂ نظر سے اس پر غور کیا جاتا اور اہلِ فن اس سلسلے اپنی رائے کا اظہار کرتے؛ تاہم شعر کی معنوی خوبیوں کی تشریح وتوضیح کی بعض مثالیں بھی جاہلیت میں ملتی ہیں، اس کا ایک پہلو یہ تھا کہ کلام میں شاعرانہ صداقت کی تلاش کی جاتی تھی کہ اس میں کس حد تک مبالغہ ہے، کذب کا پہلو تو نہیں ہے! نیز یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ جاہلیت میں جو میلے اور بازار لگتے ان میں شعراء اپنا اپنا کلام پیش کرتے اور کسی بڑے شاعر کو حکم مقرر کیا جاتا، اس چیز نے عربوں کے تنقیدی شعور کو بیدار کرنے میں کافی اہم کردار ادا کیا۔

پھر دور اسلام کے آغاز کے ساتھ ہی تنقیدی شعور کو اور غذا ملی، وجہ اس کی یہ ہے کہ قرآن آخری درجہ کا معجزانہ کلام ہے، اس کے لفظی ومعنوی اعجاز نے عربوں کو اس پر غور کرنے کے لیے مجبور کیا، اس طرح زبان وادب کے معیار اور تنقیدی اصول کو تلاش کرنے کی راہ ہموار ہوئی، یہاں تک کہ قرآن کے خارجی فنی عناصر نے ہی بلاغت کو وجود بخشا، جو فنی تنقید کے لیے بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے، اور اسی سلسلے میں اعجاز القرآن کے نام سے مستقل فن سامنے آیا جو تنقید کے فن کو آگے بڑھانے میں

معاون ثابت ہوا، ابتداءً جاحظ (متوفی ۲۵۵ھ) پھر ابوالحسن الرمانی (متوفی ۳۸۴ھ) اور ابوہلال عسکری (متوفی ۳۹۵ھ) نے قرآنی اعجاز بیانی کے اسرار ونکات معلوم کرنے کی کوشش کی، پھر باقلانی (متوفی ۴۳۴ھ)، شیخ عبدالقاہر الجرجانی (متوفی ۴۷۱ھ) اور زمخشری (متوفی ۵۳۸ھ) نے اس فن کو کمال تک پہنچایا، بالخصوص جرجانی کی دلائل الإعجاز اور أسرار البلاغة اس فن کی بے نظیر کتابیں ہیں۔

اسلام نے بیک وقت شعر کی مدح وذمت کر کے اس کا معیار مقرر کیا، اس لحاظ سے تنقید کو گویا مذہبی حیثیت حاصل ہوئی، جس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام نے ادب برائے ادب یا ادب برائے تفریح کے بجائے ادب برائے زندگی کی تعلیم دی اور اسی بنیاد پر اس کی رہنمائی کی۔ یہی وجہ ہے کہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض اشعار کی مختصراً تنقید کی ہے، پھر خلافتِ راشدہ کے عہد میں اس کی کئی مثالیں ملتی ہیں۔ اس دور کی تنقید کی ایک خاص بات یہ ہے کہ تمام تنقیدی اقوال میں ایجاز ہے اور بالعموم کسی کلام کے حسن وقبح کا معیار دین کو قرار دیا گیا ہے، اور بقول شخصے: ''ادبی تنقید جو ابھی اپنی کونپل سے باہر بھی نہیں آئی تھی، اس کو خاص قسم کا رنگ وبو اسلامی اقدار ومزاج اور روح کی شکل میں دیا گیا''۔

تقریباً ایک صدی تک تنقید کا معیار اور اس کی رفتار یہی رہی، لیکن یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ پہلی صدی ہجری کے آخری سالوں میں یعنی اموی دور کے اواسط میں فنی تنقید نے خاصی ترقی کی، اس کے مختلف اسباب ہیں: مال ودولت کی فراوانی، سیاسی اختلافات کے سبب گروہ بندی، علوم وفنون کی جانب توجہ اور علمی مراکز کا قیام، اور یہ بھی حقیقت ہے کہ شعر ونقد کو پروان چڑھانے میں خلفاء نے براہِ راست دلچسپی لی، اس طرح حجاز، عراق اور شام کے علاقوں میں شعر ونقد کو برگ وبار لانے کا موقع ملا، بعض مبصرین یہاں تک رائے زنی کرتے ہیں کہ ادبی تنقید، دیہات، شہر اور تہذیبی مراکز ہر جگہ عام ہوگئی۔

اس دور میں بعض شعر وادب کے اداشناس اور فن کے رمز شناس بھی تھے، اس میں عجاج (متوفی تقریباً ۹۰ھ)، خالد بن صفوان المعروف بابن الأهتم (متوفی ۱۳۳ھ)، سیدہ سکینہ بنت حسین بن علی اور ابن ابی عتیق (عبداللہ بن محمد بن عبدالرحمٰن بن ابی بکر الصدیق متوفی تقریباً ۱۱۰ھ) کے نام مشہور ہیں، ان لوگوں کی اپنے زمانے میں تنقید میں کافی شہرت تھی، بالخصوص ابن ابی عتیق کی تنقید میں کچھ اصول بھی پائے جاتے ہیں۔

پھر شعراء کے آپس کے تنقیدی مباحث اور ان کے کلام کے محاسن ومعائب کی تلاش نے تنقیدی پہلو کو اور پھلنے پھولنے کا موقع فراہم کیا، ان میں اموی دور کے مشہور شعراء: جریر (متوفی ۱۱۰ھ) فرزدق (متوفی ۱۱۰ھ) اور اخطل (متوفی ۹۰ھ) سب سے معروف ہیں۔

خلاصہ یہ کہ اس دور میں شعر کے اوزان ومعانی کے علاوہ شاعر کے احساسات پر بھی ناقدوں نے تنقید کی، شاعری کے جذبے اور اس کے احساس میں صداقت کے علاوہ اس میں تکلف یا افترا سے گریز بھی لازمی سمجھا گیا۔ غرض، اس دور میں ناقدوں نے داخلی وخارجی عناصر دونوں پر تنقید کر کے تنقید کو نئی جہت دی اور اس کا دائرہ وسیع کیا۔

عہد عباسی میں تصنیف وتالیف کا آغاز ہوا تو ادبی تنقید کے معیار ومسائل بھی ضبطِ تحریر میں لائے گئے، راویوں نے اشعار کے انتخابات کے علاوہ تنقیدی اقوال کا ایک بڑا ذخیرہ چھوڑا، اس نے تنقیدی فکر کو آگے بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا، اس کے ساتھ ہی اصحابِ قلم نے تنقیدی اقوال، اشعار کے انتخاب اور شعراء کے تذکرے مرتب کرنے کی طرف بھی توجہ کی، ان کتابوں میں ابوزید القرشی (متوفی ۱۷۰ھ) کی جمهرة

أشعار العرب المفضل الضبی (متوفی ۱۷۵ھ) کی المفضلیات، اصمعی (متوفی ۲۱۶ھ) کی الأصمعیات، محمد بن سلام الجمحی (متوفی ۲۳۲ھ) کی طبقات فحول الشعراء اور خلیفۂ عباسی ابن المعتز (متوفی ۲۹۶ھ) کی طبقات الشعراء شامل ہیں، لیکن تنقیدی مباحث کے نقطۂ نظر سے محمد بن سلام جمحی کی کتاب کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔

ابن سلام جمحی پہلا ناقد ہے جس نے اپنے معاصر لغویوں اور راویانِ شعر کے فنی ادبی اور تنقیدی مباحث کو خالص علمی رنگ دیا، اس سے قبل کسی ناقد نے تنقید کو علمی شکل میں پیش نہیں کیا، بقولِ دیگر: ابن سلام پہلا شخص ہے جس نے ادبی تنقید کو مستقل فن کا درجہ دیا، اس نے اس کے کچھ اصول وضع کیے، اور اس جانچ پرکھ کو نقد اور پرکھنے والے کو ناقد کا نام اسی نے دیا۔

اس نے ناقد کے لیے وسعتِ معلومات، مختلف تہذیبوں اور ثقافتوں سے واقفیت، حسن وقبح کے مابین فرق کرنے کی صلاحیت بنیادی اصول قرار دیا، اور تنقید کے لیے نص کی تحقیق لازمی قرار دی۔

اس کے بعد جاحظ (متوفی ۲۵۵ھ) اور ابن قتیبہ (متوفی ۲۷۶ھ) نے قرآن کریم کے مطالعے کی روشنی میں اسلوب کی خصوصیات اور فنی خوبیوں کو اجاگر کیا تو بلاغت کے اصول ادبی تنقید کے لیے بنیادی معیار کے طور پر سامنے آئے، مبرد (متوفی ۲۸۶ھ) ثعلب (متوفی ۲۹۱ھ) اور ابن المعتز (متوفی ۲۹۶ھ) نے اسی بلاغت کے دائرے میں اسلوب کے جمالیاتی عناصر کو فنی شکل میں پیش کیا، اور ابن طباطبا (متوفی ۳۲۲ھ) نے شعر کے لیے بعض نئے معیار قائم کیے۔

ابوتمام (متوفی ۲۳۱ھ) نے صنائع بدائع کے استعمال سے عربی شاعری کے اسلوب ومعانی کو جو نئی راہ دکھائی اس نے قدیم وجدید کی بحث کا آغاز کیا، اس ادبی معرکہ آرائی کی وجہ سے نئے تنقیدی اصول ومعیار اور نئے تنقیدی رجحانات سامنے آئے، خاص طور سے الآمدی (۳۱۷ھ) کی الموازنہ بین الطائیین میں فنی تحلیل وتعلیل، تحقیق وتنقید اور تجزیاتی وعملی تنقید کو ایسے اصولوں کے ساتھ پیش کیا گیا ہے کہ وہ مشرقی تنقید کے لیے مثالی تنقیدی معیار ثابت ہوئے۔ آمدی کی تنقید، تحقیق پر مبنی ہے، نیز اس سے اس کے پختہ ذوق کا بھی ثبوت ملتا ہے، تعصب سے اس کا تعلق نہیں، بلکہ تحلیل وتجزیہ اس کی اہم خصوصیت ہے۔

متنبی (متوفی ۳۵۴ھ) کی شاعرانہ جدت، زندگی کی تصویر کشی، فکر وخیال کی رعنائی اور احساس ووجدان کی پختگی نے تنقیدی میدان میں ایک نیا محاذ کھولا، اور اس کے موافقین ومخالفین نے ذوقِ سخن شناسی کی ایسی داد دی کہ ادبی تنقیدی کتابوں اور رسائل کا ایک ذخیرہ جمع ہوگیا، ان میں قاضی ابوالحسن الجرجانی (متوفی ۳۶۲ھ) کی تصنیف الوساطة بین المتنبی وخصومہ سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے، اس زمانے میں الصاحب بن عباد (متوفی ۳۸۵ھ)، ابوطالب البغدادی معروف بہ الوحید (متوفی ۳۸۵ھ)، محمد بن الحسن الحاتمی (متوفی ۳۸۸ھ)، ابن جنی (متوفی ۳۹۲ھ)، اور ابن وکیع التنیسی (متوفی ۳۹۳ھ)، ابوالعباس النامی (متوفی ۳۹۹ھ) نے بھی تنقید میں شہرت حاصل کی۔

اسی اثناء میں ارسطو کی الشعر اور الخطابة کے ترجموں نے نئی معلومات فراہم کیں اور اس کی کتاب "بوطیقا" کا تنقید پر اثر پڑا۔ قدامہ بن جعفر (متوفی ۳۳۷ھ) نے بلاغت اور یونانی تنقید دونوں کے امتزاج سے منطقی انداز فکر کے ساتھ کچھ ایسے تنقیدی اصول پیش کیے جو خارجی معیاروں اور مسائل کا احاطہ تو کرتے ہیں مگر ناقدینِ فن کو ان میں فنی جمالیاتی عناصر

نظر نہیں آتے۔

ابو نصر فارابی (متوفی ۳۳۹ھ) نے بھی ارسطو کے تنقیدی افکار ونظریات سے استفادہ کیا، فارابی نے شعر کے بنیادی عناصر کی تعیین کی، اس نے وزن کو شعر کے لیے ضروری قرار دیا اور اسی طرح اس نے ناقد کے لیے بھی شعری اوزان اور محاسن ومعائب سے واقفیت ضروری قرار دی۔ ابن سینا (متوفی ۴۲۸ھ) اور ابن رشد (متوفی ۵۹۵ھ) نے بھی یونانی کتابوں سے استفادے کے زیر اثر بعض تنقیدی اصول کا اضافہ کیا۔

ابوالہلال عسکری نے اس فن میں قابل قدر کوششیں کیں، اس نے تنقید اور بلاغت کو دو مختلف فنون کی حیثیت سے تقسیم کیا۔

پانچویں صدی ہجری میں ابن رشیق (متوفی ۴۶۳ھ) نے تنقیدی افکار وخیالات کو فنی انداز میں اس طرح جمع کیا کہ اصول تنقید کی ایک جامع اور مبسوط کتاب العمدۃ سامنے آئی، اس کتاب میں تنقید کو ایک جامع اور مرتب فن کا درجہ دیا گیا۔

اسی طرح اندلس کی سرزمین پر بھی تنقید کو برگ وبار لانے کا موقع ملا، ابوعلی القالی (متوفی ۳۵۶ھ) کی کتاب الأمالی نے تنقید کو آگے بڑھایا، اسی طرح حازم القرطاجنی (متوفی ۶۸۴ھ) نے بھی نقدِ ادب میں شہرت حاصل کی، اس کا دور انحطاط کا تھا، مگر اس دور میں اس نے شعر وادب اور تنقید کی نئی کرن دکھائی اور مناھج البلغاء وسراج الأدباء جیسی کتاب لکھی، اور شعر کے خارجی عناصر واسباب کے ساتھ داخلی خصوصیات سے بحث کی۔

ابن خلدون (متوفی ۸۰۸ھ) نے دور انحطاط میں زبان وادب کا جو اسلوب اپنایا، ادبی تنقید کے لیے وہ بڑی اہمیت رکھتا ہے، ان کے تنقیدی نظریات کی یہ اساس ہے کہ انھوں نے الفاظ میں تکلف اور قافیہ آرائی کے بجائے، معانی کو ترجیح دی اور فکر کو کسی بھی فن پارے کے لیے اہمیت دی۔

اس دور انحطاط میں مشرقی ناقدینِ ادب نے اہل یورپ سے نفرت کے نتیجے میں یونانی تنقید سے بالکل منھ موڑ لیا، اور عربی سرچشموں ہی کو اپنی تنقید کی بنیاد قرار دیا۔ ان ناقدین میں ابن الاثیر الکاتب (متوفی ۶۳۷ھ) کا نام زیادہ روشن ہے، اس کی کتابیں: المثل السائر فی أدب الکاتب والشاعر اور کفایۃ الطالب فی نقد کلام الشاعر والکاتب اس فن کی اہم کتابیں سمجھی جاتی ہیں، اس کے علاوہ قاضی فاضل (متوفی ۵۹۶ھ)، ابن ظافر (متوفی ۶۱۳ھ)، ابن نباتہ (متوفی ۶۳۷ھ) اور المظفر بن الفضل (متوفی ۶۵۶ھ) کے کارنامے بھی ادبی تنقید کے میدان میں نمایاں ہیں۔ اسی دور میں صرف ونحو اور ادب وبلاغت کی معرکۃ الآرا کتاب مفتاح العلوم لکھی گئی، جس کے مصنف یوسف بن ابی بکر السکاکی (متوفی ۶۲۶ھ) ہیں، اور اسی زمانے میں زکی الدین ابن ابی الاصبع (متوفی ۶۵۴ھ) نے التحبیر فی علم البدیع اور پھر اس کا خلاصہ تحریر التحبیر کے نام سے لکھا، اور بدیع کے اقسام کو شعری محاسن میں شامل کیا، نیز بدیع کے تدریجی ارتقا اور اس کے تنقیدی مفاہیم کی تعیین کی۔ اس سے پہلے اسامہ بن منقذ (متوفی ۵۸۴ھ) نے البدیع فی نقد الشعر کے نام سے کتاب لکھی تھی، اسی کی گویا ابن ابی الاصبع نے تقلید کی۔

پھر جمود کا دور شروع ہوا اور نقد میں کوئی نئی چیز سامنے نہیں آئی، بلکہ سابقہ کتابوں کی تلخیص اور شرح کا کام کیا جانے لگا، مثلاً: بدرالدین بن مالک (متوفی ۶۸۶ھ) نے بلاغت میں المصباح فی اختصار المفتاح لکھی، پھر جلال الدین قزوینی المعروف بہ خطیب دمشق (۷۳۹ھ) نے تلخیص المفتاح تحریر کی، اسی طرح دو ایک کتابیں اور لکھی گئیں۔

سولہویں صدی عیسوی میں یورپ کی اٹھان اور

بیداری کے ساتھ علوم وفنون کو بھی فروغ ہوا، اس طرح نقدِ ادبی کو پھر پھلنے پھولنے کا موقع ملا۔ پہلے پہل فرانسی شاعر کورنائے (متوفی ۱۶۸۴ء) نے Le Cid نامی ناول لکھ کر اس کا آغاز کیا۔ اس نے ارسطو کے وضع کردہ قواعد کی پابندی نہیں کی، تو سارے ناقدین اس کے خلاف ہوگئے، مگر اس سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ کچھ ناقدین میں جرأت پیدا ہوئی کہ قدیم راستے سے ہٹ کر نئی روشنی میں نقد کا راستہ تلاش کریں، اسی طرح انگلینڈ میں توماس جرائے (متوفی ۱۷۷۱ء) فرانس میں پدرو (متوفی ۱۷۸۴ء) جرمنی میں یسنج (متوفی ۱۷۸۱ء) نے اس نظریے اور جدید نقد کی ترویج کی، ایک لحاظ سے اٹھارویں صدی میں جرمنی کو گویا نقد میں امامت کا درجہ حاصل ہوا۔ انیسویں صدی میں یہ امامت فرانس منتقل ہوگئی، ولیمان (متوفی ۱۸۷۰ء) نے نقد کو پروان چڑھانے میں اہم کردار ادا کیا اور اسی طرح اسی زمانہ میں نزار (متوفی ۱۸۸۸ء) نے نقد کے کچھ قواعد مقرر کیے۔ انیسویں صدی کے اواخر میں نقد وادب کو سائنس اور علوم طبعیہ کے ساتھ خلط ملط کرنے کا رجحان پیدا ہوا، فرانس کے مشرق پر تسلط کی وجہ سے عالم عربی پر اس کی زبان وادب اور علم وفن کا اثر پڑنا بھی ضروری تھا، اس جدید دور میں جس شخص نے نقد ادبی کی قیادت کی، وہ ابراہیم یازجی (متوفی ۱۳۲۴ھ/۱۹۰۶ء) ہے، اس نے رائج زبان واسلوب کتابت پر شدید تنقیدیں کیں اور اس میں اصلاح کی پرزور کوشش کی۔ جہاں تک شعر میں جدت کا تعلق ہے تو بارودی (متوفی ۱۳۲۲ھ/۱۹۰۴ء) شوقی (متوفی ۱۳۵۱ھ/۱۹۳۲ء) اور حافظ (متوفی ۱۳۵۱ھ/۱۹۳۲ء) جیسے باکمال شاعر مصر میں ابھرے اور سخن کو نئی جہتوں سے واقف کرایا۔ اسی زمانے میں مصر میں خلیل مطران (متوفی ۱۳۶۸ھ/۱۹۴۹ء) مازنی (متوفی ۱۳۶۸ھ/۱۹۴۹ء) اور عقاد (متوفی ۱۳۸۳ھ/۱۹۶۴ء) نے شعر گوئی کے ساتھ نقد ونظر پر بھی کافی توجہ کی، انھوں نے قصیدے کے لیے روایتی قافیہ بندی غیر ضروری تو قرار دی، مگر اس کو بالکل کالعدم کرنا ان کے نزدیک جائز نہیں تھا، بلکہ انھوں نے بیچ کی راہ نکالی، اور اس کو کافی پزیرائی ملی، اور تمام عربی ممالک میں اس کے آثار نظر آنے لگے۔ مہجری ادباء نے بھی اس تنقیدی ذوق کو آگے بڑھانے میں قابل قدر کوششیں کیں، جن میں جبران خلیل جبران (متوفی ۱۳۴۹ھ/۱۹۳۱ء) اور پھر میخائیل نعیمہ (۱۴۰۹ھ/۱۹۸۸ء) نے اہم رول ادا کیا، نعیمہ نے گویا نقد ہی کو اپنا اصل موضوع قرار دیا، اس کی کئی کتابیں اس فن پر ہیں، پھر احمد امین (متوفی ۱۳۷۳ھ/۱۹۵۴ء) نے نقد ادبی کو خاصا آگے بڑھایا اور سید قطب (متوفی ۱۳۸۷ھ/۱۹۶۶ء) نے اپنے ابتدائی دور میں ادب وتنقید میں اپنی کوششوں کو مرکوز کیا، مگر اس دور اخیر میں جس شخص نے ادبی تنقید میں سب سے زیادہ شہرت حاصل کی، وہ طٰہٰ حسین (۱۳۹۳ھ/۱۹۷۳ء) ہے، اس نے ادبی تخلیقات کے ساتھ نقد کو بھی اپنے افکار وآرا سے مزین کیا، اور اس کے بعد ادباء وناقدین نے اس کے افکار سے کافی استفادہ کیا۔ اسی طرح نقد ادبی کے تعلق سے محمد کرد علی (متوفی ۱۳۷۲ھ/۱۹۵۳ء)، عمر فاخوری (متوفی ۱۳۶۵ھ/۱۹۴۶ء)، مارون عبود (متوفی ۱۳۸۲ھ/۱۹۶۲ء)، بطرس بستانی (متوفی ۱۳۸۹ھ/۱۹۶۹ء)، احمد الشایب (متوفی ۱۳۹۶ھ/۱۹۷۶ء)، انیس مقدسی (متوفی ۱۳۹۷ھ/۱۹۷۷ء)، جبرائیل جبور (متوفی ۱۴۱۱ھ/ ۱۹۹۱ء)، فواد بستانی (متوفی ۱۴۰۴ھ/ ۱۹۹۴ء)، ابو الحسن علی الحسنی الندوی (متوفی ۱۴۲۰ھ/۱۹۹۹ء) اور تاریخ ادب کے مشہور مصنف شوقی ضیف (متوفی ۱۴۲۶ھ/۲۰۰۵ء) کو بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

☆☆☆

اقبال اور اقبالیات

از: پروفیسر عبدالحق

تبصرہ نگار: ڈاکٹر تابش مہدی

حکیم مشرق علامہ اقبال (۱۸۷۷-۱۹۳۸ء) کی شخصیت اور شاعری انیسویں صدی عیسوی کے ربع آخر کے بعد کی نسل کے لیے محتاج تعارف نہیں۔ انھوں نے اپنی اردو و فارسی شاعری اور فلسفیانہ افکار و خیالات سے علمی دنیا کے ایک بڑے طبقے کو متاثر کیا ہے، اور یہ طبقہ کسی ایک زبان یا قوم و ملت تک محدود نہیں بلکہ انسانی برادری کے ہر طبقے اور ہر رنگ و نسل کے لوگ اس میں شامل ہیں۔ وہ ایک شاعر بھی تھے اور مفکر بھی، ان کی شاعری میں ہم دانائی حکیم بھی دیکھتے ہیں اور عصائے کلیم بھی۔ وہ زندگی کے پیامی بھی ہیں اور ناقد بھی۔ ان کی شاعری میں ہمیں زندگی بھی ملتی ہے اور اس کے رموز بھی۔ ان پر اب تک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، مسلسل لکھا جا رہا ہے اور آئندہ بھی لکھا جاتا رہے گا۔ بلکہ اگر میں یہ کہوں تو شاید مبالغہ نہ ہوگا کہ اب تک اردو کے شعرا میں جتنا کچھ علامہ اقبال پر لکھا گیا بہ استثنائے غالب اب تک اُتنا کسی پر بھی نہیں لکھا گیا۔ پروفیسر عبدالحق (۱۹۳۹) کی حالیہ تصنیف ''اقبال اور اقبالیات'' بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ جسے مصنف نے اردو اکادمی دہلی کے مالی اشتراک سے شائع کیا ہے۔

پروفیسر عبدالحق ۲/مارچ ۱۹۳۹ء کو ہندوستان کی مردم خیز بستی مچھلی شہر (ضلع جون پور، یوپی) میں پیدا ہوئے۔ انٹر میڈیٹ تک کی تعلیم اپنے وطن میں حاصل کی۔ گریجویشن، پوسٹ گریجویشن اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں گورکھپور یونیورسٹی سے حاصل کیں۔ تنقید و تحقیق سے انھیں خصوصی دل چسپی رہی ہے۔ اب تک مختلف موضوعات پر کم و بیش دو درجن کتابیں شائع ہو چکی ہیں ان میں اقبال کے ابتدائی افکار، تنقید اقبال، اقبال کی شعری اسالیب، اقبال کے فکری اسالیب، بکھرے خیالات، انتخاب حاتم، متاع سخن، عصری لغت، مولانا آزاد کے افکار و اسالیب اور رشید احمد صدیقی کے افکار و اسالیب کو خصوصی اہمیت حاصل ہے، اقبالیات کا تنقیدی مطالعہ ان کی تحقیق کا موضوع رہا ہے۔ اس پر انھیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض ہوئی ہے۔

زیر نظر کتاب اقبال اور اقبالیات پروفیسر عبدالحق کے ۱۳ مضامین پر مشتمل ہے، ان کے عناوین اس طرح ہیں: اقبال اور مقامِ شہیری، اقبال کے عمومی اثرات، اقبال کا شعری آہنگ،

سرسید مصور اقبال، اقبال کی غالب شناسی، اقبال کی بیدل شناسی، اقبال اور تصوف، اقبال کی تحریروں میں تحریف، اقبال اور نقدِ فراق کی نارسائی، کرتا ہے ترا جوشِ جنوں تیری قبا چاک، گزشتہ دہائی میں اقبالیات، علی گڑھ میں اقبالیات اور ابلیس کی شورائی مجلسیں یہ وہ مضامین وہ مقالات ہیں جو مختلف اوقات میں متعدد سمیناروں اور علمی وادبی مذاکروں کے لئے لکھے گئے اور ان میں پڑھے بھی گئے، ان میں کچھ مضامین تو ایسے ہیں جو کسی کتاب یا مجلے میں شائع بھی ہو چکے ہیں اور کچھ ایسے جو ابھی تک غیر مطبوعہ تھے۔

پروفیسر عبد الحق نے کلام اقبال کو ایک ایسے جام جہاں نما کے طور پر دیکھا ہے، جس میں حرف وصوت کے ہزاروں پیکر ملتے ہیں۔ ان کے نزدیک اِن پیکروں میں جم و کے یا سنجر وسلیم کی دارائی اور جنیدؒ و بایزیدؒ کی درویشی کے احوال اور مقام دانش وبینش کی دعوت بھی ملتی ہے اور علم وآگہی کے امکانات کی بے کراں دنیا بھی آباد ہے۔

پروفیسر عبد المغنی اور بعض دوسرے اقبال پسند ناقدوں کی طرح عبدالحق کا بھی خیال ہے کہ عالمی ادبیات میں کسی بھی فن کار کے ہاں وسعتوں کی وہ پہنائی نہیں ملتی، جو اقبال کے یہاں ہے، عبدالحق نے بعض ناقدین کے اس خیال سے اتفاق کیا ہے کہ اقبال حالؔی کی توسیعی شکل ہیں۔ اس کی تصویب کے لئے انھوں نے اقبال کے ان نثر پاروں کا تذکرہ کیا ہے، جو انھوں نے غالبؔ کے فکروفن کی فسوں کاری کے سلسلے میں تحریر کئے ہیں۔ ان کی رائے میں حالؔی کے بعد اقبال دوسرے غالب شناس ہیں، جنھوں نے غالبؔ کی شعری وفنی عظمت کے اعتراف میں جس تنقیدی بصیرت کا اظہار کیا ہے، وہ غالبیات کے باب میں ابھی تک نایاب ہے۔ عبدالحق نے اقبال کے شعر:

ہے جہاد اللہ کے رستے میں بے تیغ و سپر
ہے جسارت آفریں شوقِ شہادت کس قدر

کو خصوصی اہمیت دیتے ہوئے لکھا ہے کہ اقبال کی فکر میں یہی شوق شہادت ہے، جس کی مختلف صورتوں نے اقبالؔ کے کلام کو گل گونہ خوں سے لالہ زار کیا ہے۔ ان کی رائے میں اقبالؔ نے مرثیے کی تقدیس کو جو تفکیری بلندی و برنائی بخشی ہے، اس کی مثال پورے رثائی ادب میں کہیں نہیں ملتی اور نہ کوئی دوسرا ان کا حریف ہو سکا۔ اس موقع پر دامنِ اعتدال چھٹتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

پروفیسر عبدالحق نے اپنے مضمون ''اقبال کے عمومی اثرات'' میں لکھا ہے کہ اقبالؔ کو صرف شاعری کے وسیلے سے سمجھنا دشوار ہے۔ انھیں صرف شاعر سمجھ لینا مغالطہ پیدا کر سکتا ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے رشید احمد صدیقی کا یہ قول نقل کیا ہے:

''یہ تصور کرنا بھی غلط ہوگا کہ ان (اقبالؔ) کے تمام خیالات ان کی تحریروں میں منتقل ہو گئے ہیں۔ ایک سنجیدہ طالب علم کو محسوس ہوتا ہے کہ اقبال کو بہت کچھ کہنا تھا۔ کاش انھیں تھوڑا اور وقت ملا ہوتا یا فکر معاش سے آزاد ہوتے تو ہمیں اور کچھ دے گئے ہوتے۔ کیا یہ المیہ نہیں ہے کہ وہ روٹی کی خاطر عدالتوں کی خاک چھانتے رہے، ان کی غیرت کو ٹھیس پہنچانے کے لئے ایک ہزار روپے کا چیک دیا گیا، جسے انھوں نے خدائی کی زکوٰۃ کہہ کر واپس کر دیا۔ نظام رہے نہ ریاست، کلام اقبال باقی ہے، اقبال کے مطالعے میں ایک دل دکھانے والی کہانی ہے۔ ان سب تکلیفوں کے باوجود ان کے استقلال پر حرف نہ آیا۔ اگرچہ سینے میں ایک پیکار برپا تھا، جو دہکتی آگ کی طرح جسم وجان کی قیمت مانگتا رہا۔ وہ اپنے پڑھنے والوں سے کہتے رہے ذرا میرے دل میں جھانک کر تو دیکھو۔''

''اقبال کا شعری آہنگ'' عبدالحق کی ایک ریڈیائی تقریر ہے۔ یہ تقریر مضمون کی شکل میں بعض رسائل میں بھی شائع ہوئی۔ کلیم الدین احمد نے اپنی اس کتاب میں اس کا حوالہ دیا ہے، جو اقبال شکنی کے ذیل میں آتی ہے۔ عبدالحق نے اپنے اس مضمون میں لکھا ہے کہ اقبالیات کے مطالعے سے یہ بات ذہن نشین ہوتی ہے کہ وہ فن پر خاطر خواہ متوجہ نہیں ہیں۔ ان کی بعض نثری تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں فن شاعری سے کم دل چسپی ہے اور انھوں نے خاص مقاصد کے بیان کے لئے شعری اسلوب اختیار کیا ہے۔ عبدالحق کی شناخت ایک اقبال پسند کی حیثیت سے بھی ہوتی ہے اور ایک اقبالیات کے عالم کی حیثیت سے بھی۔ ان کا یہ بیان ان لوگوں کے نقطۂ نظر کی تقویت کا سبب بن سکتا ہے، جو اقبال کو شاعری میں کوئی اہم درجہ نہیں دیتے۔

''سرسید مصور اقبال'' کتاب کا ایک اچھا اور وقیع مضمون ہے، یہ مضمون قاری کو نہ صرف اپنی طرف متوجہ کرتا ہے بلکہ اس وقت تک اسے اپنی گرفت سے آزاد نہیں ہونے دیتا، جب تک کہ مضمون اختتام کو نہ پہنچ جائے، عبدالحق نے لکھا ہے کہ سرسید کی نشوونما ولی اللہی تحریک کے زیر سایہ ہوئی اور ان کی تربیت میں یہ تحریک مرکزی مقام رکھتی ہے۔ یہ بات اس حد تک تو درست ہو سکتی ہے اور ہے کہ سرسید کی ابتدائی زندگی کے شب و روز اسی خانوادے کے بزرگوں کے ساتھ گزرے۔ شاہ عبد العزیز اور شاہ اسماعیل شہید سے ان کے خصوصی تعلقات رہے ہیں۔ ان کی تعلیم بھی اسی خانوادے کے بزرگوں سے ہوئی۔ لیکن یہ کہنا احتیاط اور دانش مندی کے منافی ہے کہ ان کی ذہنی و فکری تربیت بھی اسی خانوادے کے زیر سایہ ہوئی۔ اس لئے کہ ان کے دینی افکار ولی اللہی روایت اور عام اہل سنت والجماعۃ کے افکار و عقائد سے یکسر مختلف تھے۔ وہ ملائکہ، اجنہ اور شیاطین کے وجود، معجزات کے ظہور، معراج کے وقوع اور اجماع کو حجت نہیں تسلیم کرتے تھے۔ یہ وہ باتیں ہیں جنھیں محض نقطۂ نظر کا اختلاف کہہ کر نہیں گزرا جا سکتا۔

عبدالحق نے اقبال کی غالب شناسی پر گفتگو کرتے ہوئے اقبال کو غالب کے ذہنی افق سے بہت آگے دیکھا ہے۔ اس کا سبب ان کے نزدیک اقبال کی انفرادی تخلیقی توانائی کے علاوہ اقبال کی وسعتِ مطالعہ اور ملکی و بین الاقوامی سیاست کی کشاکش ہے۔ عبدالحق کا یہ رویہ بعض ناقدین کے اضطراب کا سبب بھی بن سکتا ہے اور ان پر اقبال کے ساتھ بے جا عقیدت مندی کا فتویٰ بھی عائد کر سکتا ہے۔

''اقبال اور نقد فراق کی نارسائی'' کتاب کا ایک اہم مضمون ہے۔ اس میں عبدالحق نے فراق گورکھپوری کی ان تحریروں کا عالمانہ جائزہ لیا ہے، جو انھوں نے اقبال کی شاعری سے متعلق تحریر کی تھیں۔ وہ اس عہد کے مختلف رسائل میں شائع ہوئیں اور علمی و ادبی حلقوں میں ان پر خاصا اضطراب رہا۔ فراق سے متعلق عبدالحق کی یہ رائے ناقابل تردید ہے کہ فراق کے تنقیدی تصورات کسی نظام یا نظریہ سے نہ ماخوذ ہیں اور مستعار، بلکہ تمام تر شخصی تاثرات کے تابع ہیں اور یہ بھی کہ ''فراق کی مزعومہ تنقیدی نظر اور ان کے فکر و خیال کی ناہم واری انھیں انتقادی انصاف سے محروم کر دیتی ہے۔''

حقیقت یہ ہے کہ ''اقبال اور اقبالیات'' اپنے موضوع پر ایک اہم اور قابل مطالعہ کتاب ہے۔ یہ کتاب جہاں ایک طرف ناقدین کو اقبال اور ان کے فن سے متعلق سوچنے اور غور کرنے کی دعوت دیتی ہے وہیں اردو تنقید کے وسیع منظر نامے پر اپنے مصنف کی منفرد شناخت بھی قائم کرتی ہے۔ بلاشبہ یہ کتاب اردو تنقید کے قیمتی ذخیرے میں ایک خوش گوار اضافہ ہے۔

☆☆☆

تعارف کتاب

''خواجہ عزیز الدین عزیز- حیات وشاعری''

.....ڈاکٹر ہارون رشید صدیقی

''خواجہ عزیز الدین عزیز-حیات و شاعری'' تصنیف ڈاکٹر فوزیہ خاتون۔

مذکورہ کتاب پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے، جو شعبہ فارسی لکھنؤ یونیورسٹی میں ڈاکٹر فوزیہ خاتون کے ذریعہ مرتب ہوا ہے۔ صفحات ۳۲۰ ہیں، کمپوزنگ وطباعت صاف ستھری ہے قیمت -/250 روپیہ ملنے کا پتہ: مکتبہ دانش محل امین آباد، لکھنؤ۔

کتاب پانچ ابواب پر منقسم ہے، شروع میں نگران مقالہ جناب پروفیسر احسن الظفر صاحب کا پیش لفظ ہے، پھر ڈاکٹر مسلم شبنم نوری کے ''حرفے چند'' میں مقالہ اور مقالہ نگار کا تعارف ہے پھر صاحب مقالہ نے اپنی بات لکھی ہے۔

باب اول ''تاریخی پس منظر'' پر مشتمل ہے جس میں نوابان اودھ کا مختصر تعارف آگیا ہے جو ایک طرف علم وفن کی قدردانی بلکہ خود اس میں اشتغال، شعراء و اطباء کی عزت افزائی، داد و دہش، جود وسخا کے اعلیٰ مقام پر نظر آتے ہیں تو دوسری جانب جانوروں کی لڑائی کا نظم کر کے اس سے محظوظ ہونے، رقاصاؤں سے لطف اندوز ہونے، حساب وکتاب کو فراموش کر کے عیش و عشرت میں گم ہوجانے کے سبب اسفل السافلین میں دکھائی دیتے ہیں۔ مصنفہ نے ان متضاد صفات کے حاملین کے حالات اور لکھنؤ کے عجائبات، حوالہ جات کے ساتھ منضبط کئے ہیں۔

باب دوم الف میں خواجہ عزیز کی شخصیت اور سوانح کا بیان ہے۔ خواجہ ترکی الاصل ہیں، آباء واجداد کشمیر آئے اور والد محترم لکھنؤ آبسے۔ افغانی بزرگ شیخ عبداللہ کے سوا اساتذہ کا ریکارڈ نہ مل سکا، لیکن اہل علم نے اعتراف کیا ہے کہ خواجہ صاحب فارسی کے مستند شعراء میں سے تھے، ۶۳ سال کی عمر میں کیننگ کالج لکھنؤ (جواب لکھنؤ یونیورسٹی ہے) میں فارسی کے استاد کی حیثیت سے جوائن کیا، ۷۲ سال کی عمر میں از خود علیحدہ ہوگئے، اسی باب میں اولاد کا بیان ہے اور آخر میں ۱۹۱۵ء میں وفات کا ذکر ہے۔

حصہ ''ب'' میں خواجہ صاحب کا سراپا، اخلاق وعادات اور مذہب کا بیان ہے معاصرین میں علامہ شبلی نعمانی، علامہ اقبال، علامہ الطاف حسین حالی، منشی غلام غوث، علامہ محمد حسین الہ آبادی، مولوی عبدالعزیز، علامہ عبداللہ، نواب صدیق حسن خان، مولوی محمد سعید، علامہ عبدالغنی، راجہ درگا پرشاد، منشی دلاور علی، وغیرہ کا ذکر ہے۔ اسی باب میں ان کے ذی علم تلامذہ کا تعارف بھی ہے جو اہل علم کے لئے خاصہ کی چیز ہے۔

باب سوم: ''خواجہ عزیز کی ادبی خدمات'' پر مشتمل ہے یہ باب ۱۲۶ صفحات پر پھیلا ہوا ہے، اس باب کے فارسی کلام سے فارسی داں حضرات ہی لطف اندوز ہو سکیں گے۔ خواجہ صاحب نے بہت کہا ہے اور خوب کہا ہے، ان کے فنی کمالات کا اچھا تعارف آ گیا ہے، میری نظر میں تاریخ گوئی میں خواجہ کی مثال نہیں ہے۔ نواب محبوب علی خان نظام دکن کی صحت یابی اور تخت نشینی پر لمبے قصیدے کہے ہیں جس کے ہر شعر سے چار چار طرح سے تاریخ نکلتی ہے۔ پہلے مصرعہ سے تاریخ پھر دوسرے مصرعہ سے تاریخ، پھر دونوں مصروں کے الفاظ منقوطہ سے تاریخ پھر دونوں مصرعوں کے الفاظ غیر منقوطہ سے تاریخ۔ کیا کمال ہے! میر انیس و میر دبیر کے انتقال پر بارہ بند کا مسدس کہتے ہیں جس کے ہر شعر کے پہلے مصرعہ سے مرزا انیس کی تاریخ وفات ۱۲۹۱ھ اور دوسرے مصرعہ سے مرزا دبیر کی تاریخ وفات ۱۲۹۲ھ نکلتی ہے۔

اسی باب میں تاریخ گوئی کے ضمن میں مدرسہ عالیہ فرقانیہ، ندوۃ العلماء، دار العلوم دیوبند، ایم اے او ہائی اسکول علی گڈھ (جو اب مسلم یونیورسٹی علی گڈھ ہے) اور اس کے بعض متعلقین کا مناسب تعارف آ گیا ہے جو پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

باب چہارم میں خواجہ کی نثر نویسی کا تعارف ہے اور باب پنجم میں خواجہ کے غیر مطبوعہ کلام کا ذکر ہے اور آخر میں عکس تحریر بھی ہے۔

بلاشک یہ مقالہ فارسی دانوں کے لئے تحفۂ انیقہ ہے تو اردو دانوں کے لئے بھی اہم اور مفید معلومات کا خزینہ ہے، اس طرح طلبائے اردو و فارسی دونوں کے لئے یکساں مفید ہے۔ ہر لائبریری میں اس کتاب کا ہونا ضروری ہے۔

☆☆☆

نعت

محمد مسلم شبنم نوری

میخانۂ حبیب خدا وا کہاں نہیں
ملتی ہے ان کے پیار کی صہبا کہاں نہیں

آقا کے جسم پاک کا سایہ نہ تھا مگر
دامان مصطفے کا ہے سایا کہاں نہیں

از فرش تا بہ عرش صدائے درود ہے
محبوب کبریا کا ہے چرچا کہاں نہیں

غار حرا سے وادی بطحا کے جو اٹھا
ابر کرم وہ ٹوٹ کے برسا کہاں نہیں

بھر لیجئے خوشی سے ہر اک دامن مراد
بٹتا ہے ان کے فیض کا صدقہ کہاں نہیں

ہو محفل جہاں کہ بزم ملائکہ
صل علی کا شور ہے برپا کہاں نہیں

سیراب دو جہاں ہیں بہ فیضان مصطفے
جاری ہے ان کے فیض کا دریا کہاں نہیں

مسلم بھٹک گئے جو ہدایت کی راہ سے
عالم میں ہو رہے ہیں وہ رسوا

☆☆☆

رپورٹ سیمنار بعنوان

''علامہ محمد بن طاہر پٹنی ودیگر علماء گجرات اوران کی ادبی وعلمی خدمات''

منعقدہ ۶-۸/صفر المظفر ۱۴۳۱ھ مطابق ۲۲-۲۴/جنوری ۲۰۱۰ء بروز جمعہ، شنبہ، یکشنبہ

محمد وثیق ندوی

سرزمین گجرات کو زمانہ قدیم سے علم وادب کے ساتھ خصوصی نسبت رہی ہے، یہ صدیوں تک علم وفن کا مرکز، ارباب ہنر کا گہوارا اور تصوف وطریقت کا سرچشمہ رہی ہے، یہاں کے علماء، فضلا، ادباء اور اہل قلم نے ملک وبیرون ملک کے لوگوں کو اپنے علمی کارناموں سے فیض یاب کیا ہے، بالخصوص شاہان گجرات کے عہد زریں میں یہاں علوم وفنون کی ترویج واشاعت کا غیر معمولی کام انجام پایا ہے، ماضی کے علماء ومحدثین میں سب سے مشہور نام علامہ محمد بن طاہر پٹنی کا ہے جو وسعت نظر اور تبحر علمی میں بے نظیر تھے، علوم وفنون کے ان آفتاب وماہتاب کو خراج عقیدت پیش کرنے اور دنیا کو ان کے علمی کارناموں سے روشناس کرانے اوران کے علمی وادبی فیض کو عام کرنے کے مقصد سے عالمی رابطہ ادب اسلامی (شعبہ برصغیر وممالک مشرقیہ) کی اٹھائیسویں مجلس مذاکرہ ''علامہ محمد بن طاہر پٹنی ودیگر علماء گجرات اوران کی ادبی وعلمی خدمات'' کے عنوان سے صدر رابطۂ ادب اسلامی (شعبۂ برصغیر وممالک مشرقیہ) حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی (ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ وصدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ) اوران کے رفقاء رابطہ کی سرپرستی میں ''جامعہ علوم القرآن'' جمبوسر، ضلع بھروچ، گجرات میں ۶-۸/صفر المظفر ۱۴۳۱ھ مطابق ۲۲-۲۴/جنوری ۲۰۱۰ء منعقد ہوئی جس کی مختلف نشستوں میں (۷۴) سے زائد مقالات پیش کئے گئے جن میں گجرات کے مختلف ادوار کے علماء، صلحاء، محدثین، فقہاء، مورخین اور ادباء وشعراء کی علمی، ادبی اور دعوتی خدمات کا جائزہ لیا گیا۔ اس میں ہندوستان کے مختلف شہروں لکھنؤ، رائے بریلی، بھوپال، دہلی، الہ آباد، اعظم گڈھ، اورنگ آباد، بھٹکل، حیدرآباد، ممبئی، پونہ، مالیگاؤں، ہریانہ، علی گڑھ، اکل کوا، گجرات، مئو، اعظم گڈھ وغیرہ سے تقریباً ۳۴۰ مندوب شریک ہوئے اور مندرجہ ذیل اداروں کی نمائندگی ہوئی: دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، مدرسہ ضیاء العلوم رائے بریلی، برکت اللہ یونیورسٹی بھوپال، جامعہ ملیہ دہلی، جامعہ کاشف العلوم اورنگ آباد، مدرسہ انوار العلوم اورنگ آباد، جامعہ اسلامیہ بھٹکل، جامعہ عثمانیہ حیدرآباد، معہد ملت مالیگاؤں، مدرسہ اسلامیہ قرآنیہ فیض العلوم ہریانہ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، جامعہ اشاعت العلوم اکل کوا، مدرسہ مرقاۃ العلوم مئو، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ اور مولانا ابوالحسن علی حسنی ندوی اکیڈمی بھٹکل اور گجرات کے مختلف مدارس وجامعات۔ اس کے علاوہ قرب وجوار کے مثقف اور باذوق حضرات بڑی تعداد میں ذوق وشوق کے ساتھ تمام پروگراموں میں شریک ہوئے، جامعہ علوم القرآن کے طلبہ نے بڑے ذوق وشوق کا مظاہرہ کیا اور مقالات کی نشستوں میں حاضرین وسامعین کی حاضری ودلچسپی قابل دید اور حوصلہ افزا رہی اور ذمہ داران جامعہ نے مندوبین اور شرکاء سیمنار کو ہر طرح سے راحت وآرام پہونچانے کی بھرپور کوشش کی۔

استقبالیہ : عالمی رابطہ ادب اسلامی کے تحت ''علامہ محمد بن طاہر پٹنی اور دیگر علماء گجرات اوران کی علمی وادبی خدمات'' کے موضوع پر جامعہ علوم القرآن جمبوسر، بھروچ۔ گجرات میں تین روزہ سیمینار کے افتتاح سے پہلے عالی جناب ڈاکٹر شیخ ابراہیم بلطان کھرانا چی سعودی سفارت خانہ (ہند) کا شاندار استقبال کیا گیا، عالی جناب نے اپنے تاثراتی کلمات میں ہندوستانی علماء خصوصاً گجرات کی خدمات اوران کی تعلیمی، دعوتی، اور رفاہی سرگرمیوں کو سراہتے ہوئے کہا: جب میں یہاں کے تعلیمی اداروں اوران میں تعلیم وتعلم اور تصنیف وتالیف میں مشغول علماء کو دیکھتا ہوں تو ہمیں اپنی کوتاہیوں اور کمیوں کا احساس ہوتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ لوگ یہاں جو کچھ کر رہے ہیں، بے سروسامانی اور وسائل کی قلت

کے ساتھ کررہے ہیں، ہمارے یہاں الحمدللہ وسائل واسباب کی فراوانی ہے، اس لیے آپ لوگ بڑے مبارک اور پوری امت کی طرف سے شکریہ کے اور خالق کائنات کی طرف سے اجرِ ثواب کے مستحق ہیں، جامعہ علوم القرآن کے بانی سربراہ شیخ مفتی احمد دیولوی کی نیابت کرتے ہوئے جامعہ کے استاد حدیث مولانا عبدالرشید ندوی نے سعودی کلچر اٹاچی کا استقبال کرتے ہوئے صوبہ گجرات خصوصاً بھروچ میں اسلام کی آمد کا تذکرہ کیا، انہوں نے بتایا کہ اس سرزمین کو یہ فخر حاصل ہے کہ پہلی ہی صدی ہجری میں وہ اسلام کی کرنوں سے منور ہوگئی تھی، لندن سے تشریف لائے شیخ محمد یعقوب قاسمی (رکن شوری جامعہ علوم القرآن) نے رابطہ ادب اسلامی اور جامعہ علوم القرآن کی طرف سے تمام حاضرین کو خوش آمدید کہا، اس نشست کی نظامت کے فرائض رابطہ کے سینیر رکن مولانا نذرالحفیظ ندوی ازہری صاحب نے انجام دیئے۔

استقبالیہ نشست سے پہلے جامعہ کے شاندار وسیع کتب خانہ میں ایک علمی نمائش کے ذریعہ مہمانوں کی علمی وادبی ضیافت کا انتظام تھا، نمائش میں انتہائی سلیقہ سے گجرات کے مختلف علمی مراکز میں موجود مخطوطات کو بھی پیش کیا گیا تھا، جب کہ علماء گجرات کی مطبوعہ تصانیف کے ساتھ گجراتی زبان میں شائع ہونے والے پرچوں اور ماہناموں کو رکھا گیا تھا۔

افتتاحی نشست : اس کے بعد ساڑھے دس بجے صبح ایک وسیع وخوبصورت پنڈال میں حضرت مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ مدظلہ العالی کی صدارت میں باقاعدہ سیمینار کا آغاز ہوا، تلاوت کلام پاک کے بعد طلبۂ جامعہ علوم القرآن نے ترانہ جامعہ پیش کیا، ترانہ کے بعد جامعہ کے بانی سربرہ مفتی احمد صاحب دیولوی سکریٹری رابطہ ادب اسلامی گجرات نے اپنے طویل وپرمغز خطبۂ استقبالیہ میں گجرات کی اسلامی تاریخ پر بھرپور روشنی ڈالتے ہوئے علماء ومجاہدین اور محدثین نیز موجودہ عہد کے مدارس، جامعات اور تعلیمی ودعوتی مراکز کا تفصیلی ذکر کیا، اور کہا کہ ہم بے حد شکر گزار ہیں ذمہ داران رابطہ کے کہ انہوں نے تمام راحتوں، سہولتوں اور آسائش کی پیشکش کو نظر انداز کرکے جامعہ ہی کو میزبانی کا شرف بخشا، یہ جامعہ علوم القرآن کی خوش قسمتی ہے کہ حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کی سربراہی میں صوبۂ گجرات میں اپنی نوعیت کا پہلا سیمنار منعقد کرنے کی سعادت حاصل ہورہی ہے۔

خطبۂ استقبالیہ کے بعد عالمی رابطہ ادب اسلامی برصغیر اور ممالک مشرقیہ کے سکریٹری جنرل مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی (معتمد تعلیم ندوۃ العلماء لکھنؤ) کی رپورٹ جناب مولانا نذرالحفیظ ندوی ازہری (عمید کلیۃ اللغۃ العربیۃ وآدابھا دارالعلوم ندوۃ العلماء) نے پیش کی، جس میں انہوں نے رابطہ کے اغراض ومقاصد پر روشنی ڈالنے اور مہمانوں کا استقبال کرنے کے بعد کہا: ''حضرات! علم وفن اور زبان وادب میں زمان ومکان کو بڑی اہمیت حاصل ہے، خصوصاً ادبی تخلیقات میں مکان کی بڑی اہمیت ہے، اساطین فن اور ناقدین کا خیال کا ہے کہ جس طرح کلام کے حسن وجمال میں الفاظ کے انتخاب کا اثر پڑتا ہے، ٹھیک اسی طرح ادبی تخلیقات کی اثر آفرینی، جدت ولطافت اور حلاوت میں زمان ومکان کا اہم رول ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ عالمی رابطہ ادب اسلامی جگہ کے انتخاب کو بڑی اہمیت دیتا ہے۔

ہمارا یہ سیمنار گجرات کے تاریخی شہر جمبوسر ضلع بھروچ میں جامعہ علوم القرآن کی دعوت پر منعقد ہورہا ہے، اورنگ آباد کی طرح گجرات بھی تاریخی اور جغرفیائی اعتبار سے ممتاز حیثیت رکھتا ہے، علوم وفنون کی خدمت کے تعلق سے گجرات کا نمایاں کردار رہا ہے، مغل بادشاہ شاہجہاں کی نظر میں اگرچہ ''جونپور'' ''شیراز ہند'' تھا، تو اورنگ زیب عالمگیر گجرات کو ہندوستان کی حسن وزیبائش سمجھتے تھے، ابوالفضل کے بقول اس کی حیثیت ایک گلستان کی تھی، جس میں ہر رنگ وبو کے پھول مہکتے تھے، گجرات صدیوں تک علم وفن کا مرکز، ارباب ہنر کا گہوارہ ارشاد وتلقین کا سرچشمہ، اقتصادی زندگی کی شہ رگ اور ایک سرگرم تجارتی منڈی رہا ہے، اور روحانی اور مادی زندگی کی ساری نعمتیں یہاں جمع ہوگئی تھیں، گجرات کو یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ سب سے پہلے عرب اسی سرزمین پر پہونچے،، ہندوستان کا یہی وہ علاقہ تھا جس کے سرسبز پہاڑوں پر مسلمانوں کی سب سے پہلے نگاہ پڑی تھی، ارض ہند سے عربوں کے تعلق کی ابتداء حقیقتاً اسی خطۂ سرزمین سے ہوئی''۔

استاد محترم نے ہندوستان میں اسلام کی آمد، خطۂ گجرات کی اس سلسلہ میں اولیت، اور مختلف ادوار میں گجرات کی نابغۂ روزگار شخصیات اور علوم وفنون کے مختلف میدانوں علماء گجرات کی عظیم خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا: ''علامہ محمد طاہر پٹنی جن کی شخصیت ہمارے اس ۲۸ ویں مذاکرہ علمی کا

موضوع ہے، بلند پایہ محدث تھے جن کے فضل وکمال کی شہرت پورے عالم میں ہے، علامہ طاہر پٹنی کی تصنیفات سے حجاز ویمن کے علماء اسی طرح فائدہ اٹھاتے ہیں جیسا کہ ہندوستان کے علماء، علامہ طاہر پٹنی نے مکہ مکرمہ جا کر شیخ ابوالحسن بکری، علامہ ابن حجر مکی، شیخ علی بن العراق، شیخ جاراللہ بن فہد ودیگر محدثین عظام سے حدیث شریف پڑھی، اور عرصہ تک شیخ متقی کی صحبت میں رہے، شیخ عبدالقادر حضرمی ''النورالسافر'' میں لکھتے ہیں:۔

''علامہ طاہر پٹنی زہد وورع، خشیت وانابت، تقوی اور علم وفن کے اعلی درجہ پر فائز تھے، دقت نظر، وسعت مطالعہ اور تبحر علمی میں بے نظیر تھے، مختلف علوم وفنون میں انہیں مہارت حاصل تھی، ہمارے بعض مشائخ نے فرمایا ہے کہ یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ علماء گجرات میں فن حدیث کے اندر کوئی ان سے لگا کھاتا ہو''۔ علامہ پٹنی کی عظیم الشان تصنیفات میں سب سے مشہور تصنیف لغت حدیث میں ''مجمع بحارالانوار فی غرب التنزیل ولطائف الاخبار'' ہے، جس کو یہ کہنا چاہیے کہ صحاح ستہ کی شرح ہے، نواب صدیق حسن خاں قنوجی نے اتحاف النبلاء میں لکھا ہے: ''جب سے یہ کتاب تصنیف ہوئی ہے اسی وقت سے اہل علم میں مقبول ہے، اور سب کو اس پر اتفاق ہے، علامہ محمد طاہر پٹنی نے اس کو تصنیف کر کے علماء پر بہت بڑا احسان کیا ہے''۔

اخیر عہد میں علامہ عبدالعزیز میمنی راجکوٹی کی شخصیت ہے جو عالم عربی میں قدر کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہے، علامہ محقق کی تصنیفات بحث وتحقیق کے اعلی معیار پر فائز ہیں، ان کی مشہور کتاب ''ابوالعلاء المعری وما الیہ'' ہے جو بحث وتحقیق کی کسوٹی پر کھری اترتی ہے، ایک دوسری کتاب ''سمط اللالی فی شرح الامالی للقالی'' ہے، جس میں ابوعبید بکری کا بھرپور مؤاخذہ ہے، علامہ میمنی نے اپنی کتابوں میں مستشرقین کے گمراہ کن افکار وخیالات اور تحقیقات کا بھرپور جواب ہی نہیں دیا بلکہ ان کی قلعی کھول دی ہے، خاص طور سے مرگولیوتھ اور ان کے خوشہ چیں ڈاکٹر طہٰ حسین کے گمراہ کن خیالات کا ازالہ کیا جنہوں نے پورے عالم عربی کو اپنی جادو بیانی اور نئی تحقیقات سے مسحور کر دیا تھا۔

گجرات کے علماء کی تصنیفات مختلف موضوعات تفسیر، حدیث، فقہ، علوم شرعیہ اور لغت وادب سے متعلق ہیں، ہمیں رابطہ ادب اسلامی کے سیمنار میں اس کا اہتمام کرنا ہوتا ہے کہ بحث کسی موضوع سے متعلق ہو اس کا محور ادبی اور فنی خصوصیات پر روشنی ڈالتا ہو اور اس پر ادب کی تعریف منطبق ہوتی ہو، اسی لئے اس کا خاص موضوع ''علامہ محمد طاہر پٹنی اور ان کی کتاب مجمع بحارالانوار'' مقرر کیا گیا، جس میں حدیث اور لغت کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے''۔

عالمی رابطہ ادب اسلامی شعبۂ برصغیر وممالک مشرقیہ کی مختصر کارگزاری رپورٹ پیش کرنے کے بعد مولانا محترم نے کہا: ''اخیر میں ہم آپ سب مندوبین کا اس عظیم شہر میں منعقد اس عظیم سیمنار میں استقبال کرتے ہیں اور جامعہ علوم القرآن کے ذمہ داروں اور ان کے ساتھ تعاون کرنے والوں اور معزز شہریوں کا جنہوں نے تعاون کیا، شکریہ ادا کرتے ہیں''۔

سکریٹری رپورٹ کے بعد صدر عالمی رابطہ ادب اسلامی برصغیر وممالک مشرقیہ حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی ناظم ندوۃ العلماء وصدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ (جو علالت کی وجہ سے افتتاحی نشست میں شریک نہیں ہو سکے) کا خطبۂ صدارت پیش کیا گیا جسے مولانا عبداللہ حسنی ندوی (استاد حدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء وسب ایڈیٹر پندرہ روزہ عربی اخبار ''الرائد'') نے پیش کیا، صدر محترم نے اپنے خطبہ صدارت میں جہاں تاریخ کی روشنی میں علم وادب اور حدیث اور اسلامی آداب واقدار کی ترویج واشاعت کے میدان میں گجرات کی خدمات کا ذکر کیا، وہیں رابطہ ادب اسلامی کی اہمیت وضرورت اور کارناموں پر روشنی ڈالی۔ حضرت مولانا دامت برکاتہم نے رابطہ ادب اسلامی کے مختصر تعارف کے کے بعد کہا:

''آج کا یہ سیمینار گجرات کی اس سرزمین پر منعقد ہو رہا ہے، یہاں کی سرزمین کو علم وادب سے شروع سے مناسبت رہی ہے، اور اس سرزمین نے ہمیشہ علم وفضل کے ماہ وکواکب کو اپنی آغوش میں لیا ہے، اور یہاں کے لوگوں نے دوسری جگہوں پر جا کر بھی لوگوں کو فیض یاب کیا۔

یہ علاقہ علمی، ادبی اور دینی لحاظ سے نہ صرف یہ کہ زرخیز علاقہ ہے بلکہ مسلمانوں کی اس برصغیر میں آمد کا دروازہ بھی بنا، جیسا کہ ذکر کیا جاتا ہے کہ مسلمانوں بلکہ عربوں کا اس برصغیر سے تعلق اسی سرزمین سے شروع ہوا، اور مسلمانوں کی پہلی کھیپ یہیں کے ساحلوں پر پہونچی، جس کی طرف قرون اولی سے مسلمانوں کی توجہ رہی، اور اسی سرزمین ہندوستان سے عربوں سے بلکہ حجاز مقدس سے تعلق کا نقطۂ آغاز ہوا، اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں ہی عربوں نے سواحل گجرات پر قدم رکھا تھا۔ اسی طرح کچھ صحابہ اور تابعین نے بھی یہاں کا رخ کیا، اور جب ۱۵۹ھ میں عباسی خلیفہ نے یہاں کچھ لوگوں کو بھیجا تو ان میں حضرت ابوبکر ربیع بن صبیح البصری محدث تابعی (م ۱۶۰ھ) بھی شامل تھے، جن کو یہ شرف

حاصل ہے کہ حدیث کی پہلی کتاب انہوں نے ہی تیار کی، اس کی یہ برکت ظاہر ہوئی کہ اس خطۂ ارضی کو علم حدیث سے خصوصی مناسبت رہی اور پے در پے یہاں ایسی شخصیتیں پیدا ہوتی رہیں جنہوں نے حدیث کو موضوع بنایا، اور بعد میں یہاں علامہ ابن حجر عسقلانیؒ کے شاگردوں کے شاگرد، علامہ سخاویؒ کے شاگرد، علامہ ابن حجر مکیؒ کے تلامذہ کافی تعداد میں آکر مقیم ہوئے، اور علم حدیث کی اشاعت وترویج میں اپنی زندگیاں گزار دیں۔

صوفیاء کرام، دعاۃ ومبلغین، فقہاء ومحدثین کی آمد ہوئی، اور ان کے ذریعہ اسلام کا تعارف، اسلامی علوم وفنون کا تعارف اس ملک میں ہوا، اور حکمرانوں نے بھی اس ملک کو اپنا میدان عمل بنایا، اور سلاطین گجرات نے خصوصیت کے ساتھ بڑی علمی وادبی سرپرستی کی۔ مولانا عبدالحی حسنی رحمۃ اللہ علیہ گجرات کو اس سلسلہ میں دہلی پر فوقیت دیتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ ''میں اس کو بلاخوف مخالفت کہہ سکتا ہوں کہ شاہان گجرات نے اپنے ڈیڑھ دوسو برس کے زمانہ فرمانروائی میں جس قدر علوم وفنون کی سرپرستی کی، دہلی کی شش صد سالہ تاریخ اس کی نظیر نہیں پیش کرسکتی، یہ صرف ان کی قدردانی اور حوصلہ افزائی کا نتیجہ تھا کہ شیراز ویمن ودیگر ممالک اسلامیہ کے چیدہ وبرگزیدہ علماء نے گجرات میں آکر بود وباش اختیار فرمائی جن کے فیوض سے چند دنوں میں گجرات مالا مال ہوگیا، اور خود گجرات میں اس پایہ کے علماء پیدا ہوئے جن کے فیوض علمی کی آبیاری سے اب تک ہندوستان کی درسگاہیں سیراب ہورہی ہیں۔

ان شخصیتوں کو دیکھتے ہوئے ہمارے اس سیمینار کے لئے مناسب تھا کہ گجرات میں ہم اپنا سیمینار گجرات ہی کے علماء ادب اور ان کے کارناموں کو موضوع بنا کر رکھیں، یہ علماء گجرات خواہ ان میں سے اکثر کا کام خالص ادب پر نہ ہوا ہو، لیکن حدیث شریف اور اسرار شریعت اور قرآن مجید کی تفسیر پر جو کام انہوں نے انجام دیا، اس کو بھی ادب اسلامی کے دائرہ سے باہر نہیں دیکھا جاسکتا، ادب اسلامی کا وہ بھی ایک نمونہ ہے، اور حدیث شریف کی ادبی حیثیت پر بھی ہمارا رابطہ ادب اسلامی مستقل سیمینار منعقد کرچکا ہے، اور حدیث شریف کے ان نمونوں کو جو ادب کی اعلیٰ خصوصیات رکھتے ہیں، ان کو سیمینار میں پیش کیا گیا ہے، لہٰذا حدیث شریف کے اس پہلو کو جو اس کا ادبی پہلو کہا جاسکتا ہے، حدیث شریف پر کام کرنے والوں کے کاموں سے بالکل الگ نہیں کہا جاسکتا ہے۔ اس طرح اس سیمینار کے موضوع کے دائرہ میں اکثر علماء گجرات جنہوں نے خدمت علم میں تاریخی مقام بنایا ہے، آتے ہیں''۔ (مکمل خطبۂ صدارت ''تعمیر حیات'' شمارہ نمبر ۷، ۱۰ر فروری میں شائع ہوچکا ہے)

خطبۂ صدارت کے بعد مشہور عالم دین شیخ مولانا عبداللہ کاپودروی اور عالی جناب شیخ ابراہیم بطشان نے بھی اپنے اپنے تأثرات کا اظہار کیا۔ مولانا عبداللہ کاپودروی مدظلہ العالی نے دور حاضر کے گجراتی علماء واہل علم واصحاب قلم کو اسلاف کے کارناموں کو سامنے لانے کی ترغیب دیتے ہوئے دور حاضر میں ادب کے رول کی طرف توجہ دلائی، انہوں نے اسلام کے پیغام کو عام کرنے اور اسلام کو دور حاضر کی تمام پریشانیوں اور مشکلات سے نجات دہندہ کے طور پر پیش کرنے کے مقصد سے ادب سے کام لینے پر زور دیا۔

مہمان خصوصی ڈاکٹر شیخ ابراہیم بطشان نے اپنے خطاب میں کہا کہ ''ادب اسلامی آج محتاج تعارف نہیں رہ گیا ہے بلکہ ایک اصطلاح بن گیا ہے، آج سے ۳۰ برس قبل جب یہ لفظ انہوں نے سنا تھا تو انہیں یہ لفظ بے معنی لگا تھا لیکن آج انہیں یہ کہنے کی ضرورت محسوس ہورہی ہے کہ ادب اسلامی اب ایک اصطلاح بن چکا ہے اور اسے کسی تعارف کی ضرورت نہیں ہے۔ انہوں نے کہا کہ انہیں گجرات آکر اور یہاں کے علماء سے ملاقات کرکے خوشی محسوس ہورہی ہے خصوصاً یہ جان کر کہ علامہ عبدالعزیز میمنی اسی علاقہ سے تعلق رکھتے تھے، انہوں نے مزید کہا کہ اسلامی اخلاق وتربیت پر مبنی بچوں کے ادب کی ضرورت ہے کیوں کہ بچوں کے تعلق سے اسلامی ادب میں کافی خلا محسوس ہوتا ہے۔

مہمان خصوصی نے علامہ عبدالعزیز میمنی اور محمد سورتی کا خاص طور پر ذکر کیا۔ گجرات کے علماء اور محدثین کی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے رابطہ ادب اسلامی کے بانی مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کو خراج عقیدت پیش کیا کہ انہوں نے خدمت اسلام کے لیے رابطہ کی شکل میں ایک زبردست پلیٹ فارم مہیا کیا۔

صدر اجلاس حضرت مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء دامت برکاتہم نے اپنے صدارتی خطبہ میں رابطہ ادب اسلامی کے قیام کے محرکات واسباب کا جائزہ لیتے ہوئے کہا کہ ادب اسلامی کی فکر دراصل ایک الہامی فکر تھی جسے اللہ تعالیٰ نے مفکر اسلام حضرت

مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے دل میں القا کیا تھا، حضرت مولانا اس سلسلہ میں کافی فکرمند تھے کہ آج عربی زبان کا استعمال غیر ادبی کاموں کے لیے ہو رہا ہے جب کہ اس کی ضرورت ہے کہ عربی زبان کو اخلاق سازی کے لیے استعمال کیا جائے۔ حضرت مولانا کے دل میں اللہ کی طرف سے یہ خیال پیدا ہوا کہ ادب بہت بڑی طاقت ہے، اس کو دین اسلام کے لیے منظم اور مربوط انداز میں استعمال کیا جائے، اور پوری دنیا میں اسلامی وتعمیری ادب کے علم برداروں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا جائے، صدر اجلاس نے اپنی گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا، اسلام ایک مکمل دین اور ایک جامع دستور العمل ہے، یہ کیوں کر ممکن ہے کہ ادب کے لیے اسلام کوئی ضابطہ نہ رکھے، ہدایات نہ دے۔

اس افتتاحی نشست میں گجرات کی متعدد عظیم شخصیات موجود تھیں، جن میں نمایاں شیخ عبداللہ کاپودروی (کنیڈا)، شیخ عبداللہ ہانسوی، شیخ مفتی احمد خانپوری اور شیخ یعقوب قاسمی صاحب (برطانیہ) وغیرہم شریک ہوئے، اس نشست کی نظامت استاد محترم جناب مولانا نذر لحفیظ ندوی ازہری نے کی۔ دوران سیمنار کنٹرول اور نظم وضبط قائم رکھنے کے لئے صدر رابطہ حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم کے مشورہ سے ایک مجلس عمل تشکیل دی گئی: مولانا عبداللہ سورتی صاحب (صدر) مولانا نذر لحفیظ صاحب ندوی (کنوینر) پروفیسر شفیق احمد خان ندوی (رکن) مولانا مفتی حمد دیولوی صاحب (رکن) مولانا محمد الیاس ندوی (رکن)۔ اسی طرح تیاری تجاویز کے لئے بھی چار رکنی کمیٹی بنائی گئی: پروفیسر شفیق احمد خان صاحب ندوی (کنوینر) مولانا نذر لحفیظ صاحب ندوی (رکن) مولانا محمد الیاس ندوی (رکن) مولانا اقبال احمد صاحب ندوی (رکن)۔

مقالات کی نشستیں: اس کے بعد مقالات کی نشستیں ہوئیں، تمام مقالوں کو جن کی تعداد ۷۵ پر نشستوں میں تقسیم کیا گیا، تقریباً سبھی مقالات پڑھے گئے، مقالات کی پہلی نشست بروز جمعہ بعد نماز مغرب حضرت مولانا عبداللہ کاپودروی صاحب کی صدرت میں منعقد ہوئی، اور نظامت کے فرائض مولانا محمد اقبال فلاحی ندوی مدنی نے انجام دیے، اس نشست میں نو مقالے پیش کے گئے، پہلا مقالہ ڈاکٹر مقصود احمد (شعبۂ عربی بروڈا یونیورسٹی) نے ''علم حدیث کے فروغ میں علماء گجرت کا حصہ'' کے عنوان پر پیش کیا، دوسرا مقالہ ڈاکٹر عبید اللہ فلاحی (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) نے ''شیخ علی مہائمی اور ان کی تفسیر جبیر لرحمٰن وتیسیر المنان ایک تجزیاتی مطالعہ'' کے عنوان پر پیش کیا، تیسرا مقالہ ڈاکٹر زبیر قریشی (احمد آباد) نے ''شیخ عبداللطیف بن جمال بن سراج پٹنی'' کے عنوان پر پیش کیا، چوتھا مقالہ ڈاکٹر توقیر عالم (مسلم یونیورسٹی علی گڈھ) نے مولانا محمد پالن حقانی کا تبلیغی جہاد'' کے موضوع پر پیش کیا، پانچواں مقالہ ڈاکٹر احسان اللہ فہد (مسلم یونیورسٹی علی گڈھ) نے ''مولانا محمد یوسف سورتی کی علمی ودینی خدمات'' کے عنوان پر پیش کیا، چھٹا مقالہ ڈاکٹر محمد منصور خان (مسلم یونیوسٹی علی گڈھ) کا ''علامہ شیخ وجیہ الدین علوی گجراتی'' کے موضوع پر تھا، ساتواں مقالہ مولانا محمد عارف عزیز (بھوپال) نے ''محدث کبیر علی متقی سندی علم وتقوی کی نادر مثال'' کے عنوان پر پیش کیا، آٹھواں مقالہ مولانا محمد عارف عمری (تھانہ) نے ''مولانا عبدالعزیز میمنی راجکوٹی اور ان کا دبی کارنامہ ابوالعلاء المعری'' کے موضوع پر پیش کیا، نواں مقالہ مولانا طارق انور قاسمی نے مولانا عبدالشکور قاسمی کا عربی مقالہ ''الداعیۃ الحکیم الشیخ محمد عمر البانفوری'' کے عنوان پر پیش کیا۔ نشست کے آغاز میں جناب ڈاکٹر تابش مہدی صاحب نے بارگاہ رسالت میں نذرانہ عقیدت پیش کیا جس سے سامعین پر ایک وجد طاری ہوگیا۔

مقالات کی دوسری نشست دوسرے دن صبح (بروز سنیچر ۲۳ر جنوری) حضرت مولانا محمد یعقوب قاسمی صاحب کی صدارت میں منعقد ہوئی اور نظامت کے فرائض مولانا عبدالرشید ندوی نے انجام دیے، اس نشست میں دس مقالے پڑھے گئے، پہلا مقالہ ڈاکٹر شفیق احمد خان ندوی (سابق صدر شعبۂ عربی جامعہ ملیہ دہلی) نے ''العلامۃ عبدالعزیز المیمنی حجۃ اللغۃ العربیۃ فی الھند'' کے عنوان پر عربی میں پیش کیا، دوسرا مقالہ ڈاکٹر تابش مہدی صاحب (دہلی) نے ''جمال قریشی گجرات کا ایک صالح فکر شاعر'' کے عنوان پر پیش کیا، تیسرا مقالہ مولانا عمیر صدیق ندوی دریابادی (مرتب ماہنامہ ''معارف'' دارالمصنفین اعظم گڈھ) نے ''دارالخیر گجرات اور دارالمصنفین'' کے عنوان پر پیش کیا، چوتھا مقالہ مولانا محمد یعقوب بھڑکودروی (بھروچ) نے ''علامہ محمد طاہر پٹنی اور دیگر علماء گجرت کی خدمات حدیث'' کے موضوع پر پیش کیا، پانچواں مقالہ مولانا نسیم اطہر ندوی نے ''شیخ عبدالمعطی مکی کی علمی ودینی خدمات'' کے عنوان پر پیش کیا، چھٹا مقالہ مولانا احمد کریم قاسمی (کاٹھیاواڑ) نے ''حضرت مفتی ابراہیم مانگرولی'' کے موضوع پڑھا، ساتواں مقالہ مولانا غلام رازق نے ''انٹرنیٹ اور علامہ طاہر پٹنی محدث علیہ الرحمہ'' کے عنوان پر پیش کیا، آٹھواں مقالہ خواجہ معین الدین احمد نے ''گجرات کے علماء

حدیث اور تفسیر" کے موضوع پر پیش کیا، نواں مقالہ مولانا عبدالرشید شیخ نے "محی الدین عبدالقادر عیدروس اور ان کا تذکرہ" کے عنوان پر پیش کیا۔

مقالات کی تیسری نشست حضرت مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی مہتمم دار العلوم ندوۃ لعلماء، چیف اڈیٹر مجلّہ "البعث الاسلامی" وچانسلر "اٹیگرل یونیورسٹی" لکھنؤ کی صدارت میں ساڑھے گیارہ بجے دن میں منعقد ہوئی اور نظامت کے فرائض ڈاکٹر شفیق احمد خان ندوی (سابق صدر شعبۂ عربی جامعہ ملیہ دہلی) نے انجام دئے، اس نشست میں (۱۱) مقالے پیش کے گئے، پہلا مقالہ ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی صاحب نے "گجرات کی چند نامور شخصیات ماضی اور حال کے آئینہ میں" کے عنوان پر پیش کیا، دوسرا مقالہ مولوی اجملی فاروق ندوی (دہلی) نے "محمد سورتی کی علمی وادبی خدمات" کے عنوان پر پیش کیا، تیسرا مقالہ جناب مولانا عبدالقادر پٹنی ندوی مظاہری (استاد حدیث دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنو) نے "گجرات کے علماء سلف کے بعض اہم مخطوطات" کے عنوان پر پیش کیا، چوتھا مقالہ مولانا شجاع الحق (اجین) نے "علامہ ربیع بن صبیح سعدی بصری اور ان کی خدمات" کے موضوع پر پیش کیا، پانچواں مقالہ مولانا محمد طیب ندوی (مدرسہ طوبی اجین) نے "المحدث العلامہ علی متقی اور ان کی خدمات" کے عنوان پر پیش کیا، چھٹا مقالہ مولانا عطاء اللہ مؤمن واسی (گجرات) کا "کردار کفایت" کے موضوع پر تھا، ساتواں مقالہ مولانا عبدالرحمٰن ملی ندوی (اکل کوا) نے "العلامہ الشیخ محمد بن طاہر الفتنی محدثاً أدیباً" کے عنوان پر عربی میں پیش کیا، آٹھواں مقالہ مولانا آصف یاسین پالنپوری نے "مولانا حبیب اللہ فیروزپوری کی علمی وادبی جھلک" کے موضوع پر پیش کیا، نواں مقالہ مولانا فیصل احمد ندوی (استاد دار العلوم ندوۃ لعلماء لکھنؤ) نے "گجرات کے شافعی علماء ومشائخ اور ان کی خدمات" کے عنوان پر پیش کیا۔ دسواں مقالہ شیخ علیم الدین ندوی (استاد مدرسہ کاشف العلوم اورنگ آباد) نے "علامہ محمد بن طاہر پٹنی اور دیگر علماء گجرات" کے عنوان پر پیش کیا۔

مقالات کی چوتھی نشست (منعقدہ بروز ہفتہ ۳۲؍جنوری بعد نماز مغرب) حضرت مولانا مفتی عبداللہ صاحب مہتمم جامعہ سعادت دارین ہانسوٹ) کی صدارت میں ہوئی، نظامت کے فرائض جناب مولانا عمران سعید ندوی صاحب نے انجام دئے، اس نشست میں مولانا مسعود احمد اعظمی مدرسہ مرقاۃ العلوم مئو (بعنوان "علامہ محمد بن طاہر پٹنی حیات وخدمات)، مولانا نذیر احمد بن یعقوب دیولوی بھروچی (بعنوان "شیخ مولانا احمد بن سلیمان الکردی الأحمد آبادی)، مولانا ایوب ڈبھوئی والا جمبوسر (بعنوان "علامہ محمد بن طاہر پٹنی اور ان کی دینی ادبی اور اصلاحی خدمات)، مولانا مفتی شفیق دیولوی صاحب استاد جامعہ علوم القرآن جمبوسر (بعنوان "العالم الربانی علامہ علاء الدین ابوالحسن الھمائی)، مولانا محمد سراج الدین ندوی کاکوی پالنپور (بعنوان "حضرت پیر مشائخ کی علمی وادبی خدمات)، مولانا اشرف عباس سعادتی قاسمی ہانسوٹ (بعنوان "شیخ عبدالعزیز آصف خان گجرات کے علم دوست وادب نواز وزیر باکمال)، مولانا مفتی سید مشتاق علی ندوی بھوپالی (بعنوان "علامہ طاہر پٹنی مجمع بحار الأنوار) مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی دہلی (بعنوان "بیسویں صدی کے علماء گجرات کی علمی ودینی خدمات) اور قاضی محمد حسن استاد دار العلوم ماٹلی والا گجرات (بعنوان "مفتی عبدالرحیم لاجپوری اور ان کی علمی وادبی خدمات") نے مقالات پیش کئے۔

مقالات کی پانچویں نشست (منعقدہ بروز اتوار ۲۴؍جنوری نو بجے صبح) حضرت مولانا مفتی احمد خان پوری صاحب دامت برکاتہم کی صدارت میں ہوئی، نظامت کے فرائض جناب مولانا محمد مقبول صاحب نے انجام دئے، اس نشست میں مولانا محمد ناصر ایوب ندوی ہزیانہ (بعنوان "مفتی عبدالرحیم لاجپوری اور فتاوی رحیمیہ")، مولانا محمد امین ندوی گودھرا (بعنوان "مولانا ابوالاعلی درگاہی حیات وخدمات") مولانا عنایت اللہ اکھروی (بعنوان "حضرت مولانا علی بھائی کاوی اور ان کی خدمات") مولانا حنیف مانگرولی شیخ الحدیث (بعنوان "محدثین کاٹھیاواڑ اور ادباء") مولانا رشید احمد فریدی گجرات (بعنوان "گجرات کے علامہ حریری") مولانا محمد اقبال دیولوی فلاحی ندوی مدنی ترکیسر (بعنوان "حضرت مولانا سید ابرار احمد کے خطبات کا ادبی جائزہ") مولانا وصی اللہ نور الحق قاسمی چھاپی (بعنوان "حیاۃ سماحۃ الشیخ محمد بن طاہر الفتنی وآثرہ العلمیہ والأدبیہ") مفتی محمد طلحہ بادر گڑھی دار العلوم چھاپی (بعنوان "حضرت مولانا عبداللہ سیندھی سابق مہتمم دار العلوم چھاپی") مفتی حبیب الرحمٰن ترکیسر (بعنوان "مفتی عبد الرحیم لاجپوری اور ان کی ادبی خصوصیات") اور ڈاکٹر تقی الدین ندوی مظاہری مقیم ابوظہبی (بعنوان "جھود العلامہ المحدث الفتنی وعلماء نجارت" پیش کردہ ڈاکٹر شفیق احمد خان ندوی) نے مقالات پیش کئے۔

مقالات کی چھٹی نشست ۲۴؍جنوری ساڑھے گیارہ بجے دن میں حضرت مولانا مفتی احمد دیولوی صاحب مہتمم جامعہ علوم القرآن جمبوسر کی صدارت میں منعقد ہوئی، جس کی نظامت کے فرائض مولانا محمد الیاس ندوی سکریٹری مولانا ابوالحسن علی ندوی اکیڈمی بھٹکل نے انجام دئے، اس نشست کے مقالہ نگاروں میں حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی صدر عالمی رابطہ ادب اسلامی (علماء گجرات اوران کی علمی وادبی خدمات) حضرت مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی (العلامة المحقق عبد العزيز الميمنى الراجكوتى) حضرت مولانا عبداللہ صاحب کاپودروی (علامہ قطب نہروالی الخجراتی ثم المکی مختصر حالات وخدمات) حضرت مولانا مفتی خان پوری صاحب ڈابھیل (علامہ محمد بن طاہر پٹنی حیات وخدمات) مولانا محمود حسن حسنی ندوی (مولانا عبدالوھاب صاحب متقی کے شاگرد عبدالحق محدث دہلوی) مولانا کوثر سبحانی ہمت نگر (حضرت پیر مشائخ کے عظیم احسانات) مولانا عبدالرب بن عبدالوھاب خان واپی (علم وادب کی اشاعت مین گجرات کا حصہ) محمد شکیل سعادتی اسلامپوری ہانسوٹ (ضلع بھروچ کی اسلامی تاریخ) مولانا مشتاق احمد پٹیل لوناواڈا (حضرت قاضی محمود دریائی کی سوانح) مولانا عبداللہ سعادتی ہانسوٹ (سرزمین گجرات اور علامہ شیخ محمد بن طاہر پٹنی) مولانا عبدالغفور پال (بلبل گجرات حضرت مولانا احمد اللہ راندیری) مفتی محمد اشرف سارودی استاذ جامعہ جمبوسر (عارف باللہ حضرت مولانا مفتی احمد بیمات صاحب) مولانا آفتاب عالم ندوی (تاریخ گجرات کے مصادر ومراجع) مولانا عبدالمصور ندوی (مولانا محمد عمر پالنپوری کے مواعظ علمی وادبی تناظر میں) اور مفتی عبدالقیوم راجکوٹی ڈابھیل (شہر بھروچ میں نفاس قدسیہ کی آمد اوران کی خدمات علمیہ ودینیہ) حضرات تھے۔

اختتامی نشست: اختتامی نشست حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی صدر عالمی رابطہ ادب اسلامی برصغیر وممالک مشرقیہ کی صدارت میں منعقد ہوئی، نظامت کے فرائض مولانا نذر الحفیظ ندوی ازہری نے انجام دئے، اس موقع پر دو کتابوں ''اسلامی ثقافت اور ندوۃ العلماء'' مؤلفہ ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی اور ''ملک المحدثین علامہ طاہر پٹنی حیات، افکار، خدمات'' مؤلفہ مولانا عبدالرشید ندوی استاد حدیث جامعہ علوم القرآن جمبوسر کی رسم اجراء ہوئی، اس کے بعد سیمنار کے داعی وبانی سربراہ جامعہ علوم القرآن حضرت مولانا مفتی احمد دیولوی نے مندوبین اور شرکاء اجلاس کا شکریہ کا ادا کیا، اور مولانا عبداللہ کاپودروی، مولانا ذوالفقار صاحب شیخ الحدیث وناظم تعلیمات فلاح دارین ترکیسر، مولانا اسماعیل صاحب بھڑکودوی شیخ الحدیث جامعہ علوم القرآن، مولانا محمد یعقوب کاوی اور مولانا عبداللہ حسنی ندوی نے تاثرات پیش کئے، حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی نے اپنے اختتامی کلمات میں اس بات پر زور دیا کہ اس وقت عالمی سطح پر جدید وسائل اور ذرائع ابلاغ کو استعمال کرتے ہوئے اسلام دشمن طاقتیں نئی مسلم نسل میں ادب کے نام سے الحاد اور شرکیہ وکفریہ عقائد کو داخل کرنے کی کوشش کررہی ہے، لہٰذا ہمیں بھی دعوتی حکمت علمی کو سامنے رکھتے ہوئے اسلامی حدود میں رہتے ہوئے جدید ذرائع ابلاغ اور وسائل کو استعمال کرنا چاہئے تاکہ ہماری نسل بھی ایمان اور توحید پر قائم رہ سکے اور اس کے لیے ادب کی حدود میں آنے والے تمام طریقوں کو اپنانا چاہئے۔

علماء گجرات کی علمی ودینی خدمات کے موضوع پر منعقد ہونے والے اس تین روزہ تاریخی سیمینار میں برطانیہ، امریکہ، افریقہ، اور عرب ممالک سے بھی علماء ودانشوروں اور ملک کے ایک سو سے زائد مختلف کالجز، یونیورسٹیوں اور مدرسوں سے ساڑھے تین سو سے زائد نمائندوں نے شرکت کی جس میں نمایاں طور پر برطانیہ سے مولانا محمد یعقوب صاحب قاسمی اور کینیڈا سے مولانا عبداللہ کاپودروی اور ہندوستان سے ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی، مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی معتمد تعلیم ندوۃ العلماء، مفتی احمد صاحب خانپوری، وغیرہ تھے۔ مولانا عبدالقادر پٹنی ندوی مظاہری، مولانا عبد العزیز بھٹکلی ندوی، مولانا ضیاء الحسن صاحب اور مولانا قبال احمد ندوی سیمنار کے انتظامی امور کی انجام دہی میں شروع سے آخر تک سرگرم عمل رہے، گجرات میں منعقد ہونے والے اس پہلے دو تاریخی سیمینار میں شریک مندوبین کا تاثر تھا کہ اس سیمنار سے نئی مسلم نسل کو ایک نیا حوصلہ ملا ہے۔

تجاویز: اس کامیاب سہ روزہ سیمینار کے ''پرامن بقائے باہم'' ''فلاح انسانیت اور اعلاء کلمۃ الحق کے جذبات'' سے سرشار ماحول اور اہل گجرات کے علمی وادبی کارناموں کے تناظر میں مندرجہ ذیل تجاویز سامنے آئی ہیں:

☆ سیمینار میں پیش کئے گئے مقالات کو نظر ثانی وتدوین کے مراحل سے گزار کر جلد از جلد کتابی شکل میں شائع کیا جائے، افادۂ عام کے لیے عربی اور گجراتی زبانوں میں ان کے ترجموں اور خلاصوں کی اشاعت کا اہتمام کیا جائے۔

☆ علامہ وجیہ الدین علوی، علامہ محمد بن طاہر پٹنی، مخدوم مہائمی اور دیگر بلند پایہ اہل قلم کے کارناموں کو منظر عام پر لانے اور قابل استفادہ بنانے کی غرض سے رابطہ ادب اسلامی گجرات کے زیر انتظام کوئی شعبہ یا اکیڈمی قائم کی جائے اور اسے قابل عمل بنانے کے لیے حضرت مولانا عبداللہ کاپودروی صاحب کی سرپرستی میں فوری طور پر ایک کمیٹی تشکیل کی جائے۔

☆ علماء گجرات کی علمی وادبی خدمات پر ایک ویب سائٹ لانچ کر کے ان کی تصنیفات کو آن لائن کرنے کی کوشش کی جائے۔

☆ مدارس وجامعات اسلامیہ اور عصری تعلیم گاہوں کے کتب خانوں میں اسلامی ادب اطفال کے قابل قدر اور دلکش ادبی تخلیقات کو رکھا جائے اس کے ساتھ طاقت ور گجراتی زبان میں ایک ایسا لٹریچر تیار کیا جائے جو بچوں کے شوق اور رجحان کے مطابق ان کی ذہنی، عقلی اور اخلاقی تشکیل کر سکے اور ان میں علمی وادبی مطالعہ کا ذوق نشو ونما پائے۔

☆ مختلف ذرائع ابلاغ کی مدد سے حیا سوز اور مخرب اخلاق مواد اور لٹریچر عام کیا جارہا ہے اس کے مقابلہ کے لیے جو باصلاحیت نوجوان ادباء، اہل قلم اور شعراء مثبت انداز میں اسلامی ادب کی نمائندگی کے لیے آگے آئیں ان کی بھرپور مدد کی جائے۔

☆ عصری اور دینی جامعات میں طلبہ کو علماء گجرات اور ان کی تصنیفات اور مخطوطات کو بحث وتحقیق کا موضوع بنانے کی ترغیب دی جائے، مطبوعہ کتابوں کو جدید انداز میں ایڈیٹ کر کے دوبارہ ان کی اشاعت کی جائے۔

☆ یہ سیمینار بطور خاص گجرات کے مدارس دینیہ کے ذمہ داروں سے درخواست کرتا ہے کہ وہ سرزمین گجرات سے تعلق رکھنے والی کسی ایک یا متعدد علمی شخصیات کے علمی، دینی اور ادبی کارناموں پر وقتاً فوقتاً مجلس مذاکرہ وسیمینار کے انعقاد اور اہل علم کے محاضرات اور خطبات کا اہتمام کریں تاکہ نئی نسل اسلاف کے کارناموں سے روشناس ہو۔

☆ رابطہ ادب اسلامی جو ادب کی تاثیری طاقت فکر اسلامی کی تقویت کا ایک اہم ذریعہ سمجھتا ہے، اس کے بنیادی مقاصد میں ایک اہم مقصد یہ بھی ہے کہ علاقائی زبان میں طاقتور اسلوب میں اسلامی لٹریچر تیار کرنے میں خاص طور پر بچوں اور نوجوانوں کے لیے توحید ورسالت اور بنیادی عقائد کے علاوہ اسلامی تاریخی سیرت کے موضوع پر جدید اسلوب میں کتابیں تیار کرنے میں اس کو ذریعہ بنایا جائے، اور دل کش اور معیاری انداز میں ان کو شائع کرنے کا انتظام کیا جائے۔

☆ یہ مسرت کی بات ہے کہ گجرات کے نوجوان علماء اور طلبہ اور تفسیر وحدیث اور فقہ کے علاوہ عربی ادب میں تخصص کر رہے ہیں، یہ سیمینار اہل مدارس اور ملت کے بہی خواہوں کو آواز دیتا ہے کہ گجراتی زبان میں ادب پر بھی تخصص کا انتظام کیا جائے تاکہ گجراتی زبان میں ایسے لائق اور اہل افراد کو تیار کیا جاسکے جو برادران وطن اور تعلیم یافتہ طبقہ میں دعوت دین کے فرائض کو بحسن وخوبی انجام دے سکیں۔

☆ یہ اجلاس عالمی رابطہ ادب اسلامی صدر عالی وقار حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم کا صمیم قلب سے شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے کہ اپنی صحت کی ناہمواری اور گوناگوں مصروفیات کے باوجود طویل سفر کر کے اپنی شرکت سے اسے عزت بخشی اور دست بدعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے سایہ عاطفت کو تادیر قائم رکھے، آمین

عالمی رابطہ ادب اسلامی کے اس ۲۸ ویں کل ہند علمی وادبی سیمینار میں ہندوستان کے مختلف صوبوں سے شریک ہونے والے مندوبین، اللہ رب العزت کی حمد وثنا کے بعد رابطہ ادب اسلامی اور جامعہ علوم القرآن جمبوسر کے بانی وناظم حضرت مولانا مفتی احمد صاحب دیولوی دامت برکاتہم اور ان کے رفقاء ومعاونین کے حسن انتظام، حسن ضیافت، وسعت نظری اور فراخ دلی کی قدر شناسی کرتے ہیں اور شکر گزار ہیں کہ انہوں نے انتہائی سلیقہ شعاری کے ساتھ لوگوں کو تین روز تک ایک جگہ جمع ہونے اور مؤثر ادبی پیرایہ بیان میں امن وسلامتی کے عالمگیر پیغام کو دنیا کے سامنے پیش کرنے کے ضرورت واہمیت پر متوجہ ہونے کا موقع فراہم کیا، جامعہ کے تمام معاونین اساتذہ، طلبہ اور ملازمین کے ساتھ میڈیا اور ذرائع ابلاغ کے ذمہ داروں کا شکریہ ادا کرنا اپنا اخلاقی فریضہ سمجھتا ہے کہ ان کی شب وروز کی انتھک محنت اور شوق ولگن کی وجہ سے یہ سہ روزہ عظیم الشان اجلاس کامیابی کے ساتھ اختتام کو پہونچا۔